فَقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰہِ لَا تُكَلَّفُ اِلَّا نَفْسَكَ وَ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ

حِطّین

عالمی جہاد کا داعی

۱۴۳۸ھ، شمارہ اوّل

اداریہ

دنیا کے نئے نقشے کی تعمیر

فاعتبروا یا أولي الأبصار

’پاکستان‘... ’جرنیلوں‘ کے شکنجے میں

ومن کان یؤمن باللّٰہ والیوم الآخر فلیحفظ جارہ

چین اسرائیل گٹھ جوڑ

اعرف عدوک

اہلِ سنّت کے سینے پر رافضی ریاست کا خواب

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱۴۳۸ھ، شمارہ اول

’قدس‘ سمیت ’اسلامی مقدسات‘ اور ’مسلم سرزمینوں‘ کی بازیابی،
’برصغیر‘ سمیت پوری ’مسلم دنیا‘ پر سے ’نظامِ کفر‘ کے سقوط،
امتِ مسلمہ کی ’وحدت‘ کی ضامن اور مسلمانوں کی محافظ ’خلافتِ اسلامیہ‘ کے قیام
اور ’عالمی تحریکِ جہاد‘ کا داعی

چند باتیں مجلہ 'حطین' کے بارے میں!

'حطین' امتِ مسلمہ کی ایک امانت ہے جس کا بار سب سے پہلے شہید 'انجینئر احسن عزیز' رحمہ اللہ نے ۱۴۲۸ھ میں اٹھایا تھا۔ اس کے بعد ان سے یہ بارِ امانت شہید 'استاد احمد فاروق' رحمہ اللہ کے کندھوں پر منتقل ہو گیا۔ ان دونوں حضرات نے کمال دیانت سے اس امانت کو محفوظ رکھا اور اسے امتِ مسلمہ تک منتقل کرنے کی حتی المقدور کوشش کرتے رہے۔ استاد احمد فاروق رحمہ اللہ کی شہادت کے بعد حطین میں کچھ تعطل آیا، لیکن الحمدللہ ابھی ہم اس بارِ امانت کو دوبارہ اٹھانے کا عزم کر رہے ہیں اور نئی ترتیب سے اسے اپنی امت تک منتقل کر رہے ہیں۔ ہم اس امانت سے عہدہ برآ نہ ہوں گے جب تک ہم برصغیر کے مسلمانوں کو بیت المقدس کی فتح کے لشکر تلک نہ پہنچا دیں۔

لیکن... اس لشکر میں شامل ہونے سے پہلے بھی کئی مراحل ہیں جنھیں پار کرنا ہے اور ان میں سرِ فہرست پاکستان سمیت پورے برصغیر کو اسلام کی آغوش میں لانا ہے، یہاں مسلط کفری نظام اور اس کے چلانے والے دین دشمنوں کو شکست دے کر یہاں اسلامی سلطنت کو قائم کرنا ہے۔ ضروری ہے کہ ہمارے قارئین اور مسلمانانِ برصغیر اس بار کو آگے منتقل کرنے میں ہمارے دست و بازو بنیں!

فہرست

اداریہ

دنیا کے نئے نقشے کی تعمیر

مولانا محمود حسن

الحمد لله والصلوٰة والسلام على رسول الله وعلى آله وصحبه ومن والاه، وبعد

آج ...اکیسویں صدی کی دوسری دہائی میں... جب ہم بحیثیتِ مسلمان اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیتے ہیں تو 'مایوسی' کی دبیز تہوں میں سے 'امید' کا ایک عجیب احساس دل میں پیدا ہوتا ہے۔ امید کا یہ احساس ہمیں ماضی کے اونچے دریچوں میں سے لے جا کر مستقبل کی اجلی دہلیز تک پہنچا دیتا ہے جہاں سے آگے عروج کی منزل نظر آنے لگتی ہے۔ جی ہاں! آج کی دنیا پر اگر ہم ایمانی بصیرت کے ساتھ نگاہ ڈالیں تو ہمیں یقین آجائے گا کہ تین صدیوں سے جس زوال کا امتِ مسلمہ شکار تھی، وہ عنقریب ختم ہونے والا ہے اور امت کا عروج نوشتہ دیوار ہے۔ وہ زوال جو کئی ادوار کی شکل میں امت پر گزرا اور جس میں 'مسلمان' کئی بحرانوں کا شکار رہا... 'تشخص' سے لے کر 'بقا' تک کے لیے... اسے جدوجہد کرنا پڑی، آج اس کی جدوجہد ثمر آور ہونے کو ہے۔ آج کے 'مجاہدینِ امت' دنیا کا نیا نقشہ تعمیر کر رہے ہیں، چودہ صدیاں پیشتر آنے والے جاودانی نظامِ حیات کو از سرِ نو دنیا میں رائج کر رہے ہیں، End of History کے دعویداروں اور Clash of Civilizations کے علمبرداروں کے دجل کو پاش پاش کر کے اسلامی تہذیب و تمدن کو اس کی حقیقی روح کے ساتھ چہار دانگِ عالم میں پروان چڑھا رہے ہیں اور وہ وقت... باذن اللہ... دور نہیں جب افغانستان، صومالیہ، یمن اور شام سے اٹھنے والی 'بادِ صبا' بیجنگ، موسکو، پیرس، لندن اور واشنگٹن کو اپنی لپیٹ میں لے گی اور پورا عالم 'اسلام' کے سائے میں پناہ گزیں ہو گا۔ ہمیں یقین ہے کہ ہمارے حبیب ﷺ نے ہم سے سچ فرمایا تھا:

"إن الله زوى لي الأرض، فرأيت مشارقها و مغاربها و إن أمتي سيبلغ ملكها ما زوي

لي منها"۔

"اللہ تعالیٰ نے میرے لیے زمین کو لپیٹ دیا تو میں نے اس کے مشرق و مغرب دیکھے، اور جس قدر زمین کو میرے لیے لپیٹا گیا، تمام کی تمام تک میری امت کا اقتدار پہنچے گا"۔ [1]

ایک حدیث میں اور بھی کھلے لفظوں میں فرمایا:

"ليبغلن هذا الأمر ما بلغ الليل والنهار، ولا يترك الله بيت مدر ولا وبر إلا أدخله الله هذا الدين، بعز عزيز أو بذل ذليل، عزاً يعز الله به الإسلام، وذلاً يذل الله به الكفر"۔

"اسلام کا پھیلاؤ یونہی جاری رہے گا جب تک دن رات چلتے رہیں گے۔ اور اللہ تعالیٰ زمین کے کسی شہر اور گاؤں کا کوئی گھر نہ چھوڑیں گے جس میں کہ اللہ تعالیٰ اسلام کو داخل نہ کر دیں، معزز کو عزت دے کر اور ذلیل کو ذلت کا مزہ چکھا کے۔ عزت وہ جو اللہ تعالیٰ اسلام کے ذریعے دیں گے اور ذلت وہ جو اللہ تعالیٰ کفر کے بدلے دیں گے"۔ [2]

قلبِ یورپ کے زیرِ نگیں ہونے کی بھی بشارت خود پیارے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم دے گئے:

عن أبى قبيل قال : كنا عند عبد الله بن عمرو بن العاص و سئل أي المدينتين تفتح أولا القسطنطينية أو رومية ؟ فدعا عبد الله بصندوق له حلق ، قال : فأخرج منه كتابا قال : فقال عبد الله : بينما نحن حول رسول الله صلى الله عليه وسلم نكتب، إذ سئل رسول الله صلى الله عليه وسلم : أي المدينتين تفتح أولا أقسطنطينية أو رومية؟ فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم: " مدينة هرقل تفتح أولا . يعني قسطنطينية " .

"حضرت ابو قبیل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ہم سیدنا عبد اللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے پاس موجود تھے

---

[1] اسے امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح میں اور امام ابو داود رحمۃ اللہ علیہ اور امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی سنن میں روایت کیا ہے۔

[2] اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مسند میں، امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح مشکل الآثار میں، امام طبرانی رحمۃ اللہ علیہ نے معجم کبیر میں اور امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مستدرک میں روایت کیا ہے۔ اس حدیث کی سند صحیح ہے، جیسا کہ امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ اور امام ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے۔

جبکہ ان سے پوچھا کہ قسطنطنیہ اور روما میں سے کون سا شہر پہلے فتح ہو گا؟ سیدنا عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نے ایک صندوق منگوایا جس کا کنڈہ تھا۔ پس انھوں نے اس صندوق میں سے ایک دفتر نکالا۔ راوی کہتے ہیں کہ سیدنا عبد اللہ نے فرمایا: ہم ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گرداگرد موجود تھے، کتابت کر رہے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا: قسطنطنیہ اور روما میں سے کون سا شہر پہلے فتح ہو گا؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا: 'ہرقل کا شہر پہلے فتح ہو گا'، یعنی قسطنطنیہ (اور روما بعد میں)"۔ [3]

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اٹلی کا شہر 'روما' جو ایک زمانے سے مغربی عیسائیت کا مرکز ہے جہاں 'ویٹیکن' کا شہر (Vatican City) موجود ہے، وہ بھی مسلمانوں کے ہاتھوں فتح ہو گا۔ روما فتح ہو گا تو یقیناً پیرس، لندن اور اس کے بعد واشنگٹن کی بھی باری آئے گی ان شاء اللہ۔

زوال کے ادوار

عروج پر بات کرنے اور اس کی علامتوں کو تلاشنے سے قبل ضروری ہے کہ اپنی داستانِ زوال کی ورق گردانی کی جائے۔ تبھی جا کر ہمیں اندازہ ہو گا کہ کیا 'تبدیلی' رونما ہو رہی ہے، کس 'رفتار' کے ساتھ اور کس 'نہج' پر ہو رہی ہے۔

انیسویں صدی؛ نو آبادیاتی دور میں امتِ مسلمہ

ہمارے زوال کا پہلا مرحلہ نو آبادیاتی دور پر مشتمل ہے جب مغربی استبدادی طاقتوں نے اٹھارویں صدی میں اپنے علاقوں سے نکل کر مسلم علاقوں کا رخ کیا اور امتِ مسلمہ کے ایک حصے پر اپنی یلغار کی ابتداء کر دی۔ اس یلغار کے نتیجے میں انیسویں صدی میں امتِ مسلمہ کا ایک حصہ ان مغربی استبدادی طاقتوں کے قبضے میں چلا گیا۔ برصغیر اور مصر و سوڈان پر برطانیہ نے قبضہ جمایا، انڈونیشیا کے جزائر ولندیزیوں کے قبضے میں چلے گئے جبکہ

[3] اسے امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مسند میں، امام ابن ابی شیبہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مصنف میں، امام دارمی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مسند اور امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مستدرک میں روایت کیا ہے۔ اس کی سند صحیح ہے جیسا کہ امام حاکم رحمۃ اللہ علیہ، امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ اور امام ہیثمی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے۔

الجزائر و مراکش فرانس کی کالونیاں بنیں اور وسطی ایشیائی ریاستوں کو روس نے باجگزار بنایا۔ مغربی قوتوں نے اپنی ان کالونیوں کے وسائل خوب لوٹے، یہاں مقامی باشندوں پر مشتمل اپنی وفادار افواج بنائیں اور یہاں کے کارندوں پر مشتمل انتظامیہ کھڑی کی۔ یوں استبدادی طاقتوں کے زیرِ اثر ان مسلم علاقوں میں کفر نے اپنی جڑیں مضبوط کھڑی کیں اور یہاں مضبوط انتظامی ڈھانچہ قائم کیا کیونکہ انھیں اس کام کے لیے کامل صدی ملی۔ یہ انیسویں صدی کی کہانی ہے۔

بیسویں صدی کا پہلا نصف: سقوطِ خلافتِ عثمانیہ کے بعد کی امتِ مسلمہ

اس وقت باقی بیشتر مسلم علاقے خلافتِ عثمانیہ کے ماتحت تھے۔ خود خلافتِ عثمانیہ پچھلی ایک صدی کی سازشوں کے ذریعے کمزور ہو چکی تھی اور آخری وار کے طور پر مغربی طاقتوں نے پہلی جنگِ عظیم میں عثمانیوں کے خلاف کھلی جنگ کا آغاز کر دیا۔ چار سال کی جنگ میں عثمانیوں کو شکست ہوئی، عثمانیوں کے قبضے سے یورپی علاقے چھڑا لیے گئے اور باقی ماندہ مسلم علاقے بھی مغربی طاقتوں کے قبضے میں چلے گئے۔ بالخصوص مشرقِ وسطیٰ، بحیرۂ روم کے اوپر کے مسلم ممالک اور زیریں افریقہ کے مسلم علاقے براہِ راست مغربی طاقتوں کے تسلط میں چلے گئے۔ البتہ وقت کی کمی اور عالمی بدلتے حالات کے سبب مغربی طاقتوں نے اس عرصے میں 'انتداب' (mandate) اور 'حمایہ' (protectorate) کی طرز پر مذکورہ علاقوں پر حکمرانی کی۔ اس عجلت میں مغربی طاقتوں کے پیشِ نظر اب اپنا کنٹرول برقرار رکھنا تھا اور مزید لوٹ کھسوٹ کرنا تھا۔ دوسری جنگِ عظیم نے صورتحال کو ان کے اپنے حق میں پیچیدہ کر دیا تو انھیں مجبوراً نئی حکمتِ عملی اپنانی پڑی۔

اس عرصے میں بلاشبہ رہے سہے مسلم علاقوں پر بھی کفارِ مغرب کا قبضہ ہو گیا، لیکن اتنا فائدہ ہوا کہ انھیں یہاں وقت زیادہ نہ ملا اور وہ اپنی جڑیں اور اپنے نظام کی جڑیں یہاں زیادہ مضبوط نہ کر سکے۔ بیشتر مشرقِ وسطیٰ کے عرب ممالک میں اپنے زیرِ سایہ نام نہاد بادشاہوں کو باقی رکھا جن میں شریف خاندان کے حسین، فیصل اور عبد اللہ کے نام گنے جاسکتے ہیں۔

بیسویں صدی کا دوسرا نصف؛ نام نہاد آزادیوں کا دور

دوسری جنگِ عظیم میں جب مغربی طاقتیں دوسری بار باہم دست و گریباں ہوئیں تو ان کا کنٹرول اپنے زیرِ اقتدار مسلم ممالک میں کمزور پڑنے لگا اور مسلم خطوں میں استبداد مخالف تحریکات کھڑی ہو گئیں (جن پر ہم آگے چل کر کچھ بات کریں گے)۔ بالآخر مغربی طاقتوں نے اپنی مرضی کے حکمران مسلمانوں پر مسلط کر کے پہلے نیم خود مختاری اور بعد میں نام نہاد آزادیاں دے دیں۔ ہم کسی بھی مسلم ملک کی آزادی کی داستان پڑھ لیں تو واضح نظر آجاتا ہے کہ 'قومیت' کی تحریک برپا کر کے استبدادی مغربی طاقتوں نے قوم پرستوں کے ہاتھ میں اقتدار دیا تاکہ ان کی اجارہ داری اور ماتحتی باقی رہے، کہیں اسلامی نظام کی صدائیں بلند نہ ہونے لگیں، اور جہاں جہاں ضرورت محسوس ہوئی تو اپنے آلہ کار سابقہ وفادار فوجی جرنیلوں کو مسلم ملکوں پر مسلط کیا گیا۔ شام میں 'حافظ الاسد'، انڈونیشیا میں 'سوہارتو'، لیبیا میں 'معمر قذافی'، مصر میں 'جمال عبد الناصر'، 'سادات' و 'مبارک'، تیونس میں 'بن علی'، ترکی والجزائر میں فوجی انقلابات اور پاکستان کی سیاسی تاریخ میں جرنیلی کردار... سب اسی کی واضح علامتیں ہیں۔ نتیجتاً ان آزادیوں کی نصف صدی میں بھی اسلام سیاست و حکومت و نظام کا عنوان نہ بن سکا اور امتِ مسلمہ کا زوال بدستور قائم رہا۔

ادوارِ زوال میں اٹھنے والی تحریکات اور ان کے نظریات

جس وقت امتِ مسلمہ زوال پذیر تھی اور وہ ہر طرف سے دشمنان دین وملت... استبدادی طاقتوں... کے نرغے میں تھی تو امت کو زوال سے بچانے کے لیے کئی ایک تحریکات نے جنم لیا۔ امت کے زوال کو سمجھنے کے لیے ان تحریکات کا مطالعہ از حد ضروری ہے اور ان کے مطالعہ کے لیے ہم انھیں دو بنیادی اقسام میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ خطہ کوئی سا بھی ہو، اشخاص کوئی سے بھی ہوں، ضرور انھی دو اقسام کے تحت نظر آتے ہیں۔ یہ دو اقسام درج ذیل تھیں:

1. 'نظریہ قومیت' کی علمبردار 'اصلاحی' تحریکات
2. نفاذِ اسلام اور اقامتِ دین کی تحریکات

نظریہ قومیت کی علمبردار 'اصلاحی' تحریکات

دشمن کی یلغار اور اس کے بڑھتے ہوئے غلبے کو دیکھتے ہوئے ایک قسم کی تحریکات تو وہ تھیں جنھوں نے مسلمانوں کو یہ راہ دکھلانے کی کوشش کی کہ وہ 'قومیت' کے بل بوتے پر اپنا تشخص قائم کریں اور اسی نظریہ کی بنیاد پر عروج حاصل کرنے کی جدوجہد کا آغاز کریں۔ پھر یہ قومیت کی تحریکات بھی دو رنگ میں ابھریں۔ پہلا رنگ تو خالص بے دینی کا رنگ تھا جس میں 'عرب قومیت'، 'طورانی قومیت'، 'فارسی قومیت' اور 'ہندی قومیت' کے نعرے بلند ہوئے۔ ان تحریکات کے علمبرداروں نے دینِ اسلام کی قید سے آزاد ہونے کی دعوت دی اور لوگوں کو اپنی اپنی نسلوں سے جوڑنے کا ڈھنگ سکھایا اور اسے عروج کی راہ دکھلائی۔ انیسویں صدی میں عرب قومیت کے لیے شام کے عیسائی عرب فارس نمر، یعقوب صروف اور شاہین مکاریوس، طورانیت کے لیے 'نوجوان ترک'، فارسیت کے لیے آذری الاصل فتح علی اخوند اور اس کا شاگرد جلال الدین مرزا قاجار، اور ہند کے تناظر میں 'متحدہ قومیت' کے لیے کانگریس والے متحرک رہے۔

لیکن مسلمانوں کی اسلامی حمیت نے ان تحریکات کو بیشتر مسلم خطوں میں کامیاب نہ ہونے دیا اور مسلمانوں نے دین بیزاری کے رنگ میں قومیت کے نظریات کا رد کیا اور ان لوگوں کو اسلام اور مسلمانوں کا دشمن جان لیا۔ اس بنیاد پر بیشتر تحریکات نے خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ کی، البتہ اتنا ضرور کیا کہ مسلمانوں میں عقائد و نظریات کے باب میں انتشار کے بیج بو دیے اور مستقبل میں گم کردہ راہی کے لیے ایک نقطہ آغاز ضرور ثبت کر دیا۔ ہاں! ایک جگہ اس تحریک نے زمین بھی پکڑلی اور وہ مسلمانوں کے قلب 'ترکی' میں پہلی جنگِ عظیم کے بعد شکستہ خلافت کی جڑیں کھود کر ترک قومیت کے نام پر 'جدید' ترکی کا وجود انھی لوگوں کے ہاتھوں ہو گیا۔

جب ان تحریکات کو مسلمانوں میں زیادہ پذیرائی نہ ملی تو پھر 'مسلم قومیت' کے فلسفے کی بنیاد پر تحریکات کھڑی کی گئیں۔ یہ تحریکات اپنی ذات میں اسلامی رنگ لیے ہوئے تھیں کیونکہ اس کے علمبرداروں نے اسلام کو خیر باد نہ کہا تھا بلکہ اسلام کی نسبت سے صرف قومیت کا تصور کشید کر کے 'مسلم قومیت' کی عمارت تعمیر

کرنے کی جدوجہد کا آغاز کیا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ انھیں اسلام کے عقائد واحکامات سے کوئی غرض نہ تھی بلکہ ان میں سے بیشتر گمراہ اور اس سے بھی بڑھ کر اسلام کے بنیادی عقائد میں بھی تحریف کے سبب کفر کی حدوں کو چھو رہے تھے۔ عالمِ عربی میں جمال الدین افغانی نے جس کی بنا رکھی، اسے بیسویں صدی میں طٰہ حسین، حسین ہیکل، لطفی سید نے بڑی دھوم دھام سے آگے بڑھایا۔ برصغیر کے تناظر میں تو سب جانتے ہیں کہ اس مسلم قومیت کے تصور کا بانی 'سر سید احمد خان' تھا۔ دینِ اسلام کا تو اس شخص نے اپنے مخصوص الحادی نظریات کی بدولت حلیہ ہی بگاڑ دیا، ہاں فرنگیوں کی کاسہ لیسی کرتے ہوئے مسلمانوں کے بطورِ قوم علیحدہ تشخص کی بڑی شدت سے نمائندگی کی۔ پھر اسی کی سیاسی شکل 'آل انڈیا مسلم لیگ' بنی اور اسی نے مستقبل میں 'دو قومی نظریہ' کی صورت دھار لی۔

نفاذِ اسلام اور اقامتِ دین کی تحریکات

ایک ہزار سال دنیا پر مسلمانوں کے عروج کی روح اپنے دین سے چمٹنے، اسے دنیا میں غالب رکھنے اور اس کے دفاع کے لیے چوکس رہنے میں تھی۔ سو جب مسلمانوں کے اندر کمزوری واقع ہونا شروع ہوئی اور مغربی طاقتوں کے حملے شروع ہوئے تو مسلمانوں میں علمائے کرام اور مجاہدین کی دو جماعتیں وقت کی ضرورت دیکھتے ہوئے اپنے اپنے دائروں میں متحرک ہو گئیں۔ جب اٹھارویں اور انیسویں صدی میں اول اول مغربی طاقتوں کے حملے شروع ہوئے تو علمائے کرام، صوفیائے عظام اور عامۃ المسلمین نے جہاد کی راہ اپنائی اور دیکھتے ہی دیکھتے ہر خطے میں جہادی تحریکات کھڑی ہو گئیں۔ روس کے خلاف ایشیائے کوچک میں امام غازی اور امام شامل رحمۃ اللہ علیہما کھڑے ہو گئے، افریقہ میں سنوسیوں نے کمان سنبھال لی اور برصغیر میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے متبعین میدانِ عمل میں اتر آئے۔ یہ جہادی تحریکات ایک عرصے تک مسلمانوں کو کفار کے مقابلے میں متحد کر کے ان کا مقابلہ کرتی رہیں، لیکن بالآخر مقامی مرتدین کی غداریوں کے سبب کامیاب نہ ہو سکیں، اور مغربی طاقتوں کا غلبہ بڑھتا گیا۔ جب بیسویں صدی کے آغاز میں بیشتر مسلم خطے کفارِ مغرب کے زیرِ تسلط چلے گئے تو انھی تحریکات نے ایک نیا رخ اختیار کیا اور اب یہ دفاعِ اسلام کے ساتھ ساتھ نفاذِ اسلام اور اقامتِ دین

کی تحریکات بن گئیں۔ چونکہ مغرب کے غلبے کے ساتھ ہی مسلمانوں کا ہزار سالوں سے زائد غالب رہنے والا نظامِ حکومت و معاشرت ساقط ہو گیا تھا تو اسے از سرِ نو قائم کرنے کے لیے نفاذِ اسلام کی تحریکات شروع ہو گئیں جن پر... وقت کے تقاضوں کے سبب... جہاد سے زیادہ دعوت کا رنگ غالب تھا۔ ایسا نہ تھا کہ اب ان کے پیشِ نظر جہاد جیسی عبادت نہ تھی بلکہ موقع بہ موقع جہاد و قتال بھی ان کے عمل میں داخل رہتا تھا۔ مصر میں شہید حسن البنا اور شہید سید قطب رحمہما اللہ کی 'الاخوان المسلمون'، الجزائر میں شیخ عبد الحمید بن بادیس رحمۃ اللہ علیہ کی 'جمعیۃ العلماء الجزائریین' اور برصغیر میں 'علمائے دیوبند کی جمعیتِ علماء' اور 'جماعتِ اسلامی' انھی تحریکات میں سے تھیں۔ ان تحریکات نے مسلم خطوں میں نفاذِ اسلام کا نعرہ بلند کیا اور اس کے لیے لائحہ عمل میں پہلا قدم مغربی طاقتوں سے آزادی قرار دیا۔ یہ تحریکات مسلم عوام کی امنگوں کی امین بن کر ابھریں کیونکہ مسلمانوں کی اکثریت کے دل میں اسلام کے غلبے کا جذبہ موجزن تھا اور اسلام کے نفاذ میں ہی وہ اپنی زندگی پاتے تھے۔ لیکن مغربی کفری طاقتیں ان تحریکات کی خطرناکی سے واقف تھیں اور وہ جانتی تھیں کہ ان کے ہاتھ میں اقتدار جانے کا مطلب یہ ہے کہ مستقبل میں عالمی حکومت کا ان کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو گا۔ اسی وجہ سے انھوں نے ایسی تحریکات کو کچلنے کی کوشش کی۔ پھر جب بیسویں صدی میں دو جنگوں کے بعد ان کی گرفت مسلم خطوں پر کمزور ہونے لگی اور مسلم خطوں میں آزادی کا آوازہ بلند ہونے لگا تو ان قوتوں نے نفاذِ اسلام کی تحریکات کی بجائے قوم پرستوں کو سیاست میں داخل کیا اور پھر بیشتر مسلم خطوں میں انھی کو اقتدار دے کر نام نہاد آزادی کا ڈول ڈال دیا۔

مسلم خطوں کی نام نہاد آزادیاں، قوم پرستوں کا اقتدار اور ان کی نفاذِ اسلام کی تحریکات کے ساتھ کشمکش

دوسری جنگِ عظیم کے بعد جب مسلم خطوں کی آزادی کا مرحلہ سامنے آیا تو اس آزادی کے نتیجے میں... جیسا کہ ہم نے پہلے بیان کیا ہے... مسلم علاقوں پر اقتدار قوم پرستوں کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ نفاذِ اسلام کی تحریکات نے چونکہ اپنے مقصد میں پہلا قدم مغربی طاقتوں سے آزادی رکھا تھا، تو انھوں نے مصلحت کے تحت ہر خطے میں اس آزادی کی تائید کی... چاہے اس کے نتیجے میں قوم پرست ہی اقتدار میں آئے... اور اپنی مخالفت کو

خارجی دشمن پر مرکوز رکھا۔ آزادی کے وقت قوم پرستوں نے بھی اپنی تائید کے لیے اسلامی تحریکات سے وعدہ کیا کہ وہ آزادی کے بعد اسلام کا عطا کردہ نظام ہی غالب کریں گے، لیکن یہ تو محض دھوکہ تھا اور ان قوم پرستوں کو اسلام کا نام محض کھیل کے لیے استعمال کرنا تھا۔ ایسا ہی ہوا، ہر مسلم ملک میں مقتدر طبقے نے انھی مغربی طاقتوں کی پناہ میں اپنا اپنا اقتدار مضبوط کیا اور انھی اسلامی تحریکات کو اپنے اپنے خطے میں کچلنا شروع کر دیا۔ اکیسویں صدی کے آغاز تک... آزادی کی نصف صدی اسی کشمکش سے معنون ہے۔ مصر کو دیکھیے کہ کس انداز میں جمال عبد الناصر نے آتے ہی سید قطب، عبد القادر عودہ اور دیگر زعمائے اخوان رحمۃ اللہ علیہم کو پھانسیاں دیں، شام میں حافظ الاسد نے اقتدار میں آتے ہی اخوان کے قائدین کو گرفتار کیا اور جب اس کے خلاف تحریک شروع ہوئی تو شیخ مروان حدید رحمۃ اللہ علیہ اور اسلامی تحریکات کے ہزاروں کارکنان کو کو شہید کیا، پاکستان میں قیام کے بعد ہی جب مقتدر طبقے نے اسلام سے ٹال مٹول کی تو علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے خلا ف احتجاجی تحریک کا آغاز کیا ہی تھا کہ انھیں زہر دے دیا گیا[4] اور پاکستان میں قیام کے محض ۶ سال بعد ختمِ نبوت کی تحریک کے دوران ہزاروں مسلمانوں کو شہید اور بڑے علمائے کرام کو پابندِ سلاسل کیا گیا۔ یہ تو چند مثالیں ہیں، ورنہ جو صاحبِ نظر بھی دل کی آنکھوں سے اس نصف صدی کا مطالعہ کرے گا، ایسی مثالیں مختلف مسلم خطوں میں جا بجا پائے گا۔

اس کشمکش کے نتیجے میں چند امور واقع ہوئے جنھیں ذیل میں نکات کی صورت میں دیکھا جاسکتا ہے:

- اسلامی تحریکات نے ابتداء میں آزادی کی حمایت اور اس کے نتیجے میں مقتدر آنے والے قوم پرستوں کی بھی تائید کی۔ ان سے وعدے لیے کہ وہ اسلامی نظام نافذ کریں۔ یوں ابتداءً اسلامی تحریکات نے مقتدر طبقے سے مزاحمت کی بجائے مصالحت کی پالیسی اختیار کی اور اقتدار اپنے ہاتھ میں لینے کی بجائے انھی کی تائید کی۔
- لیکن بعد میں اسلامی تحریکات کو احساس ہو گیا کہ مقتدر طبقہ اسلام سے ہر گز مخلص نہیں ہے، بلکہ وہ

[4] علماء میدانِ سیاست میں، حکیم محمود احمد ظفر، ص ۵۶۵، مکتبہ بیت العلوم

عالمی طاقتوں کے زیرِ اثر مسلم علاقوں میں اسلام مخالف سیکولر لبرل نظام رائج کرنا چاہتا ہے۔

- جب ان سے ناامیدی ہوئی تو مخالفت و مزاحمت کی آوازیں بلند ہوئیں جنھیں مقتدر طبقے نے افواج کی مدد سے کچلنا شروع کر دیا۔ یوں اسلامی تحریکات میں سے ایک حصے نے مقتدر طبقے کو داخلی دشمن قرار دیتے ہوئے ان کے خلاف قتال کی کوشش شروع کی۔ لیکن ابتداءً کمزور، غیر تربیت یافتہ اور غیر منظم ہونے کے سبب انھیں کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔
- اسلامی تحریکات کے بیشتر حصے نے... مقتدر طبقے کے جبر سے خود کو بچانے کے لیے... یہ پالیسی اختیار کی کہ پُرامن طریقے سے معاشرے میں اسلامی نظام کی راہ ہموار کی جائے اور مقتدر طبقے کے خلاف آواز بلند کرنے کے لیے جمہوری سیاست میں شمولیت اختیار کی جائے۔
- اس نکتے پر اسلامی تحریکات دو حصوں میں تقسیم ہو گئیں۔ اور ہر نازک موڑ پر مقتدر طبقے نے عالمی طاقتوں کی رہنمائی میں اپنے خلاف برسرِ پیکار اسلامی تحریکات کو کچلنے کے لیے پر امن جمہوری جدوجہد کرنے والوں کو اپنے ساتھ ملایا، وطنیت کے بیج بوئے، اپنا اور عالمی طاقتوں کا اقتدار مضبوط کیا۔

اکیسویں صدی میں امتِ مسلمہ کا عروج

یہ داستان یونہی چل رہی تھی کہ روس نے بیسویں صدی کے آخر میں افغانستان پر حملہ کر دیا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے روس کا یہ حملہ امتِ مسلمہ کے عروج کے لیے نکتہ آغاز ثابت ہوا۔ دنیا بھر کی اسلامی تحریکات سے تعلق رکھنے والے نوجوانانِ امت نے روس کے خلاف جہاد کے لیے افغانستان کا رخ کیا۔ چونکہ امریکہ کو بھی اس وقت روس کی شکست مقصود تھی تو اس نے دروازے کھولے رکھے۔ اس نے اپنی طرف سے چال چلی لیکن اس کی چال اسی پر پلٹ گئی۔ روس کے خلاف جہاد کئی پہلوؤں سے قابلِ ذکر ہے:

1. اس کی بدولت تمام اسلامی تحریکات ایک عالمی دشمن کے خلاف متحد ہو گئیں۔
2. عالمی دشمنوں کے خلاف امتِ مسلمہ میں جہاد کا دروازہ کھل گیا اور عالمی تحریکِ جہاد کا آغاز ہو گیا۔

3. دنیا بھر کے مسلم خطوں کے نوجوانوں کو جہاد کا عملی تجربہ حاصل ہو گیا۔ نوجوانانِ امت کو جہاد کی تربیت مل گئی اور اس سے قبل انھیں جس کمزوری اور ناتجربہ کاری کا مسئلہ تھا، وہ اللہ کے فضل سے دور ہو گیا۔

شیخ عبد اللہ عزام رحمۃ اللہ علیہ نے پوری امت کی قیادت سنبھالی اور آپ کی شہادت کے بعد یہ قیادت شیخ اسامہ بن لادن رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ روس کی شکست کے بعد شیخ اسامہ بن لادن رحمۃ اللہ علیہ نے پوری امت کے سامنے واضح کیا کہ اب دنیا میں مسلمانوں کا اولیں دشمن اور اسرائیل کا محافظ 'امریکہ' ہے اور اس کی سرکردگی میں جس قدر مغربی ممالک ہیں، ان کے خلاف جہاد کا آغاز کر دیا جائے اور اس نکتے پر بفضل اللہ تمام اسلامی تحریکات متحد ہو گئیں[5]۔ اس موقف کو عملی جامہ پہنانے کے لیے شیخ اسامہ رحمۃ اللہ علیہ کی قیادت میں مجاہدین نے ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کو امریکہ کے اندر حملہ کیا اور کئی ہزار امریکیوں کو نشانہ بنایا، ان کے اقتصادی و عسکری مراکز کو نشانہ بنایا۔ اس واقعے نے بھی کئی پہلوؤں کو امتِ مسلمہ کے سامنے اجاگر کر دیا:

1. امریکہ کی قیادت میں عالمی مغربی طاقتیں امتِ مسلمہ کے مقابلے میں صف آراء ہو گئیں اور انھوں نے اسلام کے خلاف 'دہشت گردی' کے نام سے جنگ شروع کر دی۔
2. مسلم ملکوں کے حکمران اور افواج امریکہ کی صف میں شامل ہو گئیں۔ یوں ان کا کفر اسلامی تحریکات کے سامنے واضح ہو گیا اور اسلامی تحریکات... جو پہلے دو حصوں میں بٹ گئی تھیں... مسلم ملکوں کے مقتدر طبقے اور افواج کے خلاف آہستہ آہستہ متحد ہونے لگیں۔ اس سے مسلم ملکوں میں مقامی حکومتوں اور افواج کے خلاف مسلح جدوجہد کو فروغ ملا اور مسلمان اس کی حمایت میں کھڑے ہونے لگے۔

---

[5] اس میں شک نہیں کہ دنیا بھر کی اسلامی تحریکات نے موقف کی حد تک امریکہ کو دشمنِ اول مان لیا، لیکن جب مجاہدین کی قیادت کے موقف کو دشمن کمزور نہ کر سکا اور نہ قیادتوں کو نشانہ بنا سکا تو اس نے شخصیات پر حملہ کر دیا۔ مجاہدین کی قیادت کے بارے میں مسلمان عوام اور اسلامی تحریکات میں شکوک پیدا کر دیے۔ اس سب کی وجہ سے اول مرحلے میں مجاہدین کی قیادتوں اور دیگر اسلامی تحریکات میں نظری اتفاق کے باوجود عملی اتفاق نہ ہو سکا تھا۔

اکیسویں صدی میں امتِ مسلمہ کے چار دشمن اور امتِ مسلمہ کے تین محاذ

رفتہ رفتہ جنگ کا دائرہ بڑھتا گیا۔ افغانستان میں جس مبارک جہاد کا آغاز ہوا، وہ امیر المومنین ملا محمد عمر رحمۃ اللہ علیہ کی قیادت میں امارتِ اسلامیہ کے قیام اور پھر امریکہ کے خلاف جنگ میں کامیابی تک پہنچا۔ پھر یہ جہاد افغانستان میں فتوحات دکھاتا ہوا صومالیہ، یمن اور شام کے بھی بڑے علاقوں کو مجاہدین کی جھولی میں ڈال گیا۔ اس معرکے میں جہاں پہلے امریکہ، اسرائیل اور ان کی قیادت میں نیٹو ممالک شامل تھے، وہاں مقامی دین دشمن حکمران اور افواج بھی دشمن کا حصہ بن گئیں، پھر روس بھی میدان میں اترا اور ایران کی قیادت میں دنیا بھر کے روافض بھی اہل السنہ کے مقابلے میں اتر آئے۔ یوں امت کے سامنے اس کے چار دشمن کھل کر آ گئے:

1. امریکہ، اسرائیل اور یورپی بلاک
2. روس
3. ایران کی قیادت میں رافضی قوت
4. مقامی مرتد حکمران اور افواج

ایران جو کل خمینی انقلاب کے بعد امتِ مسلمہ کو اپنا باجگزار بنانے کے لیے امت کے دشمنوں کو للکارنے کا عندیہ دیتا رہا ہے، آج اپنے مفاد اور رافضی پارسی جذبات کے زیرِ اثر اپنے اسلاف کی تاریخ زندہ کرتے ہوئے امت کے دشمنوں کی صف میں شامل ہو گیا ہے، بلکہ ان کے لیے ہر اول دستے کا کردار ادا کر رہا ہے۔ ۲۰۰۱ء کے وقت افغانستان پر حملے کے لیے ایران نے درپردہ امریکہ کا ساتھ دیا، پھر دو سال بعد ۲۰۰۳ء میں عراق پر حملے کے لیے امریکہ کا کھلے عام ساتھ دیا۔ چند سال بعد ۲۰۰۸ء میں یمن کے حوثیوں کی کمر ٹھونکی اور انھیں القاعدہ کے مجاہدین کے مقابلے میں یمن پر قبضے کے لیے تیار کیا۔ ایک ہی سال بعد جب امتِ مسلمہ شام میں بشار الاسد جیسے خونخوار بھیڑیے کے خلاف میدان میں نکلی تو اسی ایران نے اپنے جرنیلوں کو اس جنگ میں بشار الاسد کے لشکر کی کمان کے لیے بھیجا، دوسری طرف لبنان کی رافضی تنظیم 'حزب اللہ'... جو درحقیقت حزب الشیطان ہے... کو بشار کی تائید کے لیے جنگ میں شریک کیا، تیسری طرف دنیا بھر سے ایران نے رافضیوں کو

تربیت دے کر شام کے محاذ پر امریکہ وروس کے شانہ بشانہ کھڑا کر دیا۔ دراصل ایران کو بھی اب نظر آرہا ہے کہ امتِ مسلمہ کا عروج اب نوشتہ دیوار ہے اور مسلمانوں کے علماء ومجاہدین امت کی قیادت کے لیے میدان میں موجود ہیں، جو ایران کے رافضی پارسی نظریات کی موت کے مترادف ہے۔ اسی لیے وہ اب منافقت کا نقاب اتار کر کھلے بندوں اسلام دشمن چہرے کے ساتھ سامنے آگیا ہے۔

ان تمام دشمنوں کے مقابلے میں امتِ مسلمہ کی قیادت عالمی تحریکِ جہاد نے سنبھال لی اور دنیا بھر کی جہادی جماعتوں نے اپنے اپنے دائرہ اختیار میں ان دشمنوں کے خلاف جہاد کا آغاز کر دیا۔ اس جہاد نے تین قسم کے محاذ کھولے ہیں۔ یہ محاذ اسی تناسب سے کھلے ہیں جس طرح انیسویں اور بیسویں صدی میں مغربی طاقتوں نے مسلم علاقوں پر قبضہ کیا تھا۔ جن مسلم علاقوں پر مغربی طاقتوں کا قبضہ کمزور رہا تھا، وہاں الحمد اللہ سب سے پہلے جہاد نے زور پکڑا۔ اس کے بعد ان علاقوں میں جہادی تحریکات کھڑی ہوئیں جہاں مغربی طاقتوں نے صدی بھر قبضہ رکھا تھا۔ اور تیسرے محاذ کے طور پر امتِ مسلمہ کے نوجوانوں نے مغربی ملکوں کے اندر جہادی کارروائیوں کا آغاز کر دیا۔ یوں درج ذیل تین محاذ بنے:

1. وہ علاقے جن میں انیسویں اور بیسویں صدی میں مغربی قوتوں کا تسلط زیادہ نہ رہا تھا؛ ان میں سے پانچ جگہوں پر جہادی تحریک مضبوط ہو گئی؛ افغانستان، صومالیہ، یمن، صحرائے کبریٰ اور شام۔ اس وقت ان پانچوں علاقوں میں الحمد للہ بہت وسیع علاقہ مجاہدین کے قبضے میں ہے جہاں کفری نظام کا کوئی تسلط نہیں۔
2. وہ ممالک جن میں انیسویں اور بیسویں صدی میں مغربی قوتوں کا اقتدار مضبوط رہا تھا؛ ان میں سے پاکستان، الجزائر، لیبیا، شیشان، مصر، مالی، کینیاء سعودی عرب اور تیونس میں الحمد للہ جہادی تحریک شروع ہے اور معاشرے میں اپنی تائید پیدا کر رہی ہے۔
3. تیسرے محاذ پر مغربی ممالک میں بھی مجاہدین نے کارروائیوں کا آغاز کر دیا؛ جن میں سے امریکہ، برطانیہ، فرانس، جرمنی، اسپین اور روس میں اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے کئی کارروائیاں ہو چکی ہیں، اور یہ سلسلہ روز بروز بڑھتا جارہا ہے۔

اس سارے منظر نامے کو اگر ہم نقشے میں دیکھیں تو ایک فرحت افزا احساس دل میں یہ پیدا ہوتا ہے کہ مجاہدین کے قوت کے علاقوں سے ارد گرد کے مسلم ممالک میں تحریک زور پکڑ رہی ہے اور پھر آگے بڑھتے ہوئے یورپی ممالک تک کو اپنی لپیٹ میں لے رہی ہے۔ صومالیہ 'مشرقی افریقہ' میں امت کے عروج کا مرکز بن رہا ہے، صحرائے کبریٰ 'مغربی افریقہ' میں مرکز بن رہا ہے، افغانستان سے جنوبی اور وسطی ایشیا میں مجاہدین کی قوت زور پکڑ رہی ہے، یمن سے جزیرۂ عرب اور اماراتی ریاستوں میں امت کی قوت میں اضافہ ہو رہا ہے تو شام مشرقِ وسطیٰ میں مرکزیت اختیار کر گیا ہے، یہاں تک کہ اس کے پڑوس میں اسرائیل کے لیے اپنا دفاع خطرے میں پڑ گیا ہے اور ہمارے قبلہ اول 'مسجدِ اقصیٰ' کی بازیابی اور 'بیت المقدس' کی فتح یابی کا راستہ ہموار ہو رہا ہے۔ اور پھر یہی شام یورپ میں بھی جہاد کا دروازہ ثابت ہو رہا ہے، والحمد للہ۔

دوسری طرف یہ احساس بھی دل میں ٹنوں ہمت بھر دیتا ہے کہ ان خطوں میں آہستہ آہستہ اسلامی تحریکات کے تمام عناصر متحد ہوتے جا رہے ہیں۔ وہ جو کل تک پر امن جدوجہد کو اصل حل سمجھنے لگے تھے، آج وہ بھی جمہوری سیاست کو چھوڑ کر ان مسلم خطوں میں جہادی تحریک کے 'معاون' بن رہے ہیں اور کئی جگہوں پر 'حصہ' بھی بن رہے ہیں۔ یمن کے قبائل، اسلامی تحریکات اور معتبر علمائے دین 'انصار الشریعہ' کی چھتری تلے جمع ہو گئے ہیں۔ صومالیہ میں اسلامی عدالتوں کی تحریک سے سلسلہ بڑھتا ہوا 'حرکتہ الشباب المجاہدین' کی صورت دھار گیا جو آج صومالیہ کے اسّی (۸۰) فیصد علاقے پر قابض ہیں، بلکہ وہاں سے آگے بحرِ ہند کی طرف ساحل سے ہوتے ہوئے 'کینیا' تک میں مسلمانوں کے دفاع کے لیے لنگر انداز ہو رہے ہیں۔ شام میں سلفی، اخوانی، قطبی، صوفی... تمام طبقات... بشار الاسد، امریکہ، روس اور ایران کے خلاف متحد اور صف آراء ہیں۔ الحمد للہ، یہ منظر نامہ بتلا رہا ہے کہ دو صدیوں کے زوال کے بعد اکیسویں صدی میں امتِ مسلمہ پھر عروج کی طرف گامزن ہے اور مسلمان بفضل اللہ دنیا کا 'نیا نقشہ' تعمیر کر رہے ہیں جس میں اسلام کا پھیلاؤ اب پچھلے ادوار سے بھی آگے نظر آ رہا ہے ان شاء اللہ۔

جہادی محاذوں کے اعتبار سے دنیا کا نقشہ
مضبوط جہادی تحریک والے علاقے
علاقے جہاں جہادی تحریک مضبوط ہو رہی ہے
علاقے جہاں مجاہدین نے کاروائیاں کی ہیں
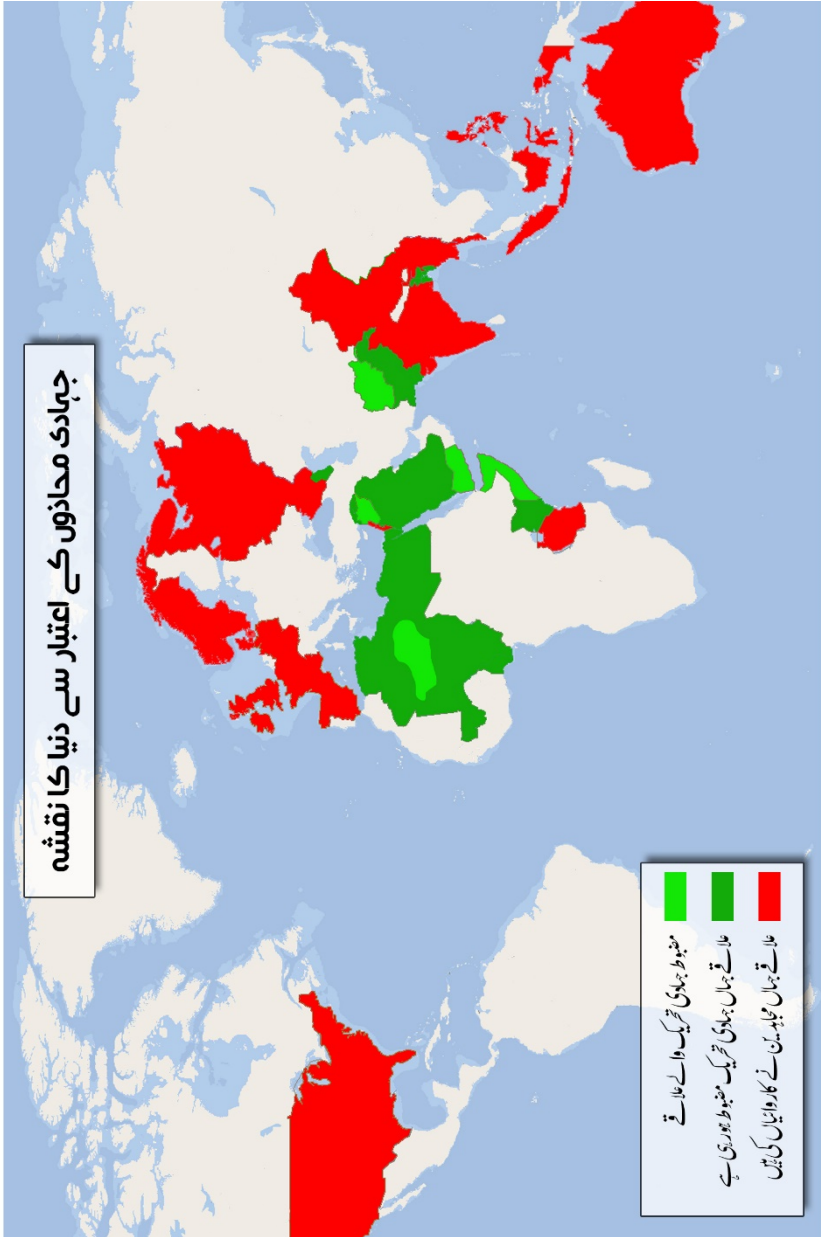
وقت کی پکار

اپنی امت بالخصوص برصغیر کے مسلمانوں کو یہ منظر دکھانے سے ہمیں مقصود یہ ہے کہ ایک تو ہم بحیثیتِ مسلمان 'احساسِ کمتری' اور 'مغرب کی برتری' کو اپنے دل و دماغ سے نکال دیں، مغرب کے ہاتھ میں کھلونا بنے میڈیا کے دجل کو سمجھیں اور اصل حقیقت سے واقف ہو جائیں، اور دوسرا یہ کہ حقیقت جان لینے کے بعد امتِ مسلمہ کے عروج میں درکار اپنے اپنے کردار کو پہچان لیں اور اس کردار کی ادائیگی کے لیے کمربستہ ہو جائیں۔

یقیناً امت کے عروج کے لیے اس کے ایک گروہ نے اپنی دنیا قربان کر رکھی ہے اور یہ منظر جو ہم دیکھ رہے ہیں، کتنے ہی جوانوں کے خون سے رنگین ہے، کتنی ہی ماؤں نے اپنے سپوتوں کو نثار کیا ہے، کتنی ہی بہنوں نے اپنے سہاگ اجڑنا برداشت کیے ہیں۔ تبھی جا کر دنیا کے نقشے میں رنگ بھر رہا ہے، لیکن ابھی نقشے میں رنگ بھرنے کا عمل شروع ہے، جسے اپنے انجام تک ضرور پہنچنا ہے۔ وقت کی پکار یہ ہے کہ اسلام کے عروج اور دنیا کے اس نئے نقشے کی تعمیر میں ہر خطے کا مسلمان بحیثیتِ فرد اور بحیثیتِ اجتماع کس قدر قربانی کے لیے تیار ہے۔ یہ عروج ابھی مکمل ہونا ہے لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ امتِ مسلمہ کا ہر طبقہ... چاہے وہ ایک عام فرد کی صورت میں ہو، چاہے وہ عالم یا طالبِ علم کی صورت میں ہو اور چاہے وہ ایک اسلامی تحریک کی صورت میں ہو، دشمنانِ اسلام کے مقابلے میں مجاہدینِ امت کے سنگ شامل ہو جائے۔ کفارِ مغرب اور ہمارے خطے کے ناہنجار غلامانِ مغرب لاکھ دہشت گردی کا ڈھنڈورا پیٹیں، مجاہدین کو لاکھ مرتبہ دہشت گرد بتلائیں اور مسلم ملکوں میں وطنیت کے نام پر مقامی حکمرانوں اور افواج کے قصیدے گائیں، ہر مسلمان اٹھ کر... دل و جان سے... ان کے آگے 'ناں' کہے اور صرف ایک 'اللہ' کے سامنے جھکتے ہوئے اس قافلۂ عروج میں مجاہدینِ امت کے ساتھ شریک ہو جائے۔

بالخصوص عالمِ اسلامی میں برسرِ عمل وہ اسلامی جماعتیں اور تحریکات... جو پر امن جمہوری جدوجہد کی علمبردار ہیں... وہ جمہوری سیاست سے کنارہ کش ہو کر ان ملکوں میں جہاں جہادی تحریک ابھی ابتدائی مراحل میں ہے، اس جہادی تحریک کے لیے معاشرے میں راہ ہموار کرنے کی ذمہ داری اٹھالیں۔ وہ خود میادینِ جہاد میں نہ بھی آسکیں تو کم از کم معاشرے میں دشمنانِ دین امریکہ و مغرب، مقامی حکمرانوں اور افواج کے خلاف

فضا ہموار کرنے کی سعی شروع کر دیں اور معاشرے میں دین کے احکام زندہ کرنے کی جدوجہد شروع کر دیں۔ تاکہ امت کے عروج کے سفر میں اسلامی تحریکات کے تمام طبقات کی جدوجہد ایک دھارے میں داخل ہو جائے اور ان کے مابین کسی قسم کا تفرقہ پیدا ہونے نہ پائے۔ گر ہم ایسا کرنے میں ابھی کامیاب ہو گئے تو یقیناً امت کے عروج کا سفر جلد تمام ہو جائے گا، وگرنہ تمام تو اسے ضرور ہونا ہے باذن اللہ، بس وقت کچھ زیادہ لگ جائے گا۔

'ضربِ عضب' کے بعد کا پاکستان اور موجودہ علاقائی صورتحال

جولائی ۲۰۰۷ء میں پاکستانی فوج نے اسلام آباد کی لال مسجد پر حملہ کیا، سینکڑوں طلبہ وطالبات کو شہید کیا۔ وجہ صرف یہ تھی کہ لال مسجد نے پاکستان میں نفاذِ شریعت کی راہ ہموار کرنے کی تحریک شروع کی تھی اور ایک سیاسی حیثیت کے ساتھ معاشرے میں اصلاح کا کام شروع کیا تھا۔ ریاستِ پاکستان کو یہ گوارانہ ہوا کہ عالمی طاقتوں کی پروردہ 'جمہوری سیاست' سے ہٹ کر پاکستان میں نفاذِ شریعت کی تحریک سیاسی حیثیت اختیار کرلے۔ پاکستان کی تاریخ میں یہ کوئی پہلا موقع نہ تھا جب شریعت کے متوالوں کو پاکستانی فوج نے تہِ تیغ کیا ہو، بلکہ قیام سے ہی یہ سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔

- ۴۷ء میں بلوچ مسلمانوں نے شریعت کے نفاذ کے ساتھ اپنے الحاق کو وابستہ کیا تو حکومت کی مرضی سے فوج نے ان پر حملہ کر کے زبردستی الحاق کیا۔
- ۴۸ء میں فقیر اپی رحمۃ اللہ علیہ کی قیادت میں وزیرستان کے مسلمانوں نے نفاذِ شریعت کے مطالبے کے ساتھ الحاق پر آمادگی ظاہر کی تو پاکستانی فوج نے ان کے جلسوں پر بمباری کی۔
- ۵۳ء میں مسلمانانِ پاکستان نے ختمِ نبوت کے اقرار کے لیے تحریک چلائی تو حکومت کی مرضی سے فوج نے سینکڑوں مسلمانوں کو سرِراہ شہید کیا، پھر بھٹو اور ضیاء دور میں بھی اسی طرح ختمِ نبوت کے متوالوں کو تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔
- ضیاء دور میں پاکستان میں رافضیت کے اثرات کے خلاف مولانا حق نواز جھنگوی شہید رحمۃ اللہ علیہ نے تحریک کا آغاز کیا تو اس تحریک سے وابستہ قائدین اور نوجوانوں کے قتل کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔
- ۹۰ء کی دہائی میں اہلِ سوات نے نفاذِ شریعتِ محمدی کی تحریک شروع کی تو وہاں پے در پے آپریشن کر کے علما و طلبہ اور اہلِ دین عوام کو شہید، گرفتار اور لاپتہ کیا گیا۔
- اس کے بعد جب لال مسجد کے علما اور طلبہ وطالبات نے تحریک شروع کی تو پاکستانی ریاست اور فوج نے اپنی سابقہ روش کے مطابق اس تحریک کو کچلنے کے لیے فوجی آپریشن کیا اور برقعہ پوش مسلمان بہنوں کو

لہو میں رنگیں کر دیا۔

ان تمام تحریکات کے دوران مقابلے میں اسلحہ نہیں اٹھایا گیا، بلکہ ایک غیر مسلح پر امن سیاسی جدوجہد کی کوشش کی گئی۔ لیکن پوری دنیا کی طرح پاکستان میں ایسی کسی جدوجہد کو پنپنے کی اجازت دینا مغربی طاقتوں کے دستور میں نہیں جو ان کے باجگزار 'جمہوری نظام' کا حصہ نہ بنے۔ دنیا بھر میں اسلامی تحریکات کو جمہوری جال میں پھانسنے کا مقصد ان اسلامی تحریکات کو اپنی گرفت میں رکھنا ہے، کیونکہ امریکہ اور مغربی طاقتیں یہ جانتی ہیں کہ جو اسلامی تحریک بھی 'پارلیمان کی بالادستی' کی دعویدار اور 'عوامی آئین کی پاسداری' کی علمبردار بن جائے گی تو وہ خود بخود انھی کے دھارے میں شامل ہو جائے گی۔ وہ دھارا... جس میں اسلامی نظام کے قیام کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستانی ناخداؤں نے ان اسلامی تحریکات کو ہمیشہ کچلا ہے جو جمہوری سیاست کے دائرے میں داخل نہ ہوتی ہوں۔

لیکن لال مسجد کے واقعے نے پاکستانی تاریخ کا دھارا بدل دیا۔ اس کے بعد یہاں کے دینی طبقے نے نیا رخ اختیار کیا اور پاکستان میں مسلط نظام، حکمرانوں اور فوج کے خلاف قتال کا آغاز ہو گیا۔ اس قتال کی ابتداء ہوئی تھی کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اہلِ دین طبقہ اس تحریک کا معاون بن گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے پاکستان میں مجاہدین کی قوت میں اضافہ ہوتا گیا۔ اس کے مقابلے کے لیے امریکہ نے پاکستان کی خوب امداد کی، جدید ترین اسلحہ فراہم کیا، تربیت دی، پاکستانی فوج نے اپنے ڈاکٹرائن میں بھارت کی بجائے مجاہدین کو اپنا پہلا دشمن قرار دیا اور یوں ایک جنگ شروع ہو گئی۔ کچھ معرکوں میں مجاہدین فتح یاب ہوئے اور کچھ میں دشمنانِ دین کو بھی موقع ملا۔ بالآخر جون ۲۰۱۴ء میں پاکستانی فوج نے فیصلہ کن حملے کی تیاری کی اور 'ضربِ عضب' کے نام سے آپریشن شروع کیا۔

اس آپریشن کے نتیجے میں جہاں مجاہدین کے علاقوں میں فوج نے حملہ کیا، وہاں شہری علاقوں میں بھی مجاہدین کے پشت پناہ اہلِ دین کے خلاف آپریشن کا آغاز کر دیا۔ مجاہدین نے حکمتِ عملی کے تحت وقتی پسپائی اختیار کرلی، تاکہ اپنی قوت بچائی جائے اور دوبارہ منظم ہو کر حملہ آور ہوا جائے۔ شہری علاقوں میں فوج اور پوری ریاستی مشینری نے اہلِ دین کے خلاف گھیرا تنگ کرنا شروع کیا اور بے شمار نوجوانوں کو پابندِ سلاسل کیا،

بہتوں کو ماورائے عدالت جعلی مقابلوں میں شہید بھی کیا اور عمومی معاشرے پر جبر کی ایک دھاک بٹھانے کی کوشش کی۔ اس سے وقتی طور پر تو ایک ٹھہراؤ کی صورت بن گئی جسے حکومت اور فوج نے اپنی جیت قرار دیتے ہوئے خوشی سے شادیانے بجائے۔

ہمیں یقین ہے کہ یہ پانی کا ایک بلبلا ہے جو سرعتِ رفتار سے سطح پر آگیا ہے اور چند ہی لمحوں میں پھوٹ کر ختم ہو جائے گا۔ اس صورتحال میں پاکستان کے علما و طلبہ اور اہلِ دین عوام کے سامنے چند باتیں واضح ہونا ضروری ہیں۔

- پہلی بات تو یہ ہے کہ الحمد للہ پاکستان میں نفاذِ شریعت کی تحریک کی تقویت پڑوسی ملک افغانستان میں امارتِ اسلامیہ کی مضبوطی کے ساتھ وابستہ ہے۔ جیسے جیسے امارتِ اسلامیہ مزید مضبوط اور مستحکم ہو گی اور تمکین کے مراحل طے کرے گی، ویسے ویسے پاکستان میں بھی نفاذِ شریعت کی تحریک مضبوط تر ہوتی جائے گی اور مجاہدین کی قوت میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ اب افغانستان میں تو ہر چڑھتے سورج کے ساتھ امارت کی قوت میں اضافہ ہو رہا ہے تو اس کا نتیجہ بھی ساتھ ہی بر آمد ہو رہا ہے۔ چنانچہ قبائلی علاقوں سے مجاہدین کی وقتی پسپائی سے اگر خلا پیدا ہوا ہے تو وہ امارت کی مضبوطی سے دوبارہ پُر ہو رہا ہے اور اس مضبوطی سے جلد قبائل بھی دوبارہ مجاہدین کے قبضے میں آجائیں گے۔ باذن اللہ
- دوسری بات یہ ہے کہ ضربِ عضب کے ذریعے پاکستانی حکمران اور جرنیل اہلِ دین عوام اور خواص کو جبر سے دبانے کی کوشش کر رہے ہیں اور انھیں یہ باور کروا رہے ہیں کہ انھوں نے مجاہدین کی قوت توڑ دی ہے تاکہ پاکستان کا دینی طبقہ ہمت ہار بیٹھے اور پاکستان میں نفاذِ شریعت کے لیے قتال کی پشت پناہی سے باز آجائے۔ ایسے میں اہلِ دین کو چاہیے کہ وہ علاقائی اور عالمی تناظر کی طرف نگاہ دوڑائیں... جس کا ذکر ہم نے اس مضمون میں کیا ہے... اور اس کے ذریعے اپنی ہمت کو مہمیز دیں اور آئندہ آنے والی فتوحات کے لیے تیار ہو جائیں، نہ کہ وقتی جبر سے دب جائیں۔
- تیسری بات یہ ہے کہ فوج نے اس موقع پر ایک گھناؤنا کھیل یہ کھیلنے کی کوشش کی ہے کہ پاکستان کے اہلِ دین طبقے میں سے ایک آواز 'پاکستانیت' کے جذبے کے تحت بلند کروائی ہے اور اس کے ذریعے مجاہدین

کی تحریک کو پاکستان دشمن ثابت کرنے اور خود کو پاکستان محافظ بتلانے کی کوشش کی ہے۔ یہ ایک گہری سازش ہے جس سے علماء وطلبہ کو باخبر رہنے کی ضرورت ہے۔ ہم نے اس مضمون میں واضح کیا ہے کہ مسلم خطوں میں اسلامی تحریکات کا مقصد نفاذِ اسلام رہا ہے اور مقتدر طبقے ہمیشہ اس کی راہ میں رکاوٹ بنے رہے ہیں۔ ایک عرصے تک پرامن کوشش کے بعد آج اسی مقصد کے حصول کے لیے قتال کا دروازہ کھلا ہے۔ پاکستان کا بھی یہی معاملہ ہے۔ پاکستان اسلام کے نام پر قائم ہوا تھا، لیکن یہاں کے مقتدر طبقے، حکمرانوں اور جرنیلوں نے ایک دن کے لیے بھی یہاں اسلام آنے نہیں دیا۔ یہ ایسی حقیقت ہے کہ جس کے ثبوت کے لیے تاریخ خود گواہ ہے۔ ۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کے بعد پاکستانی جرنیلوں نے امریکہ کے جھنڈے تلے باقاعدہ جنگ کا آغاز کیا تھا، اسی کے دفاع میں پاکستان کے اہلِ دین نے علماء کے فتاویٰ کی روشنی میں قتال شروع کیا اور انھی لوگوں نے شروع کیا جن کا ماضی معروف ہے۔ قتال کا فتویٰ دینے والے علماء بھی معروف تھے اور جنھوں نے کیا، ان کا ماضی بھی روس اور امریکہ کے خلاف جہاد سے عبارت تھا۔ میڈیا کے ذریعے لاکھ انھیں امریکہ اور بھارت کے ایجنٹ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی، لیکن عوام جان گئے کہ امریکہ کے ایجنٹ تو خود حکمران اور جرنیل ہیں، نہ کہ مجاہدین۔ ان مجاہدین کا خود مقصد پاکستان کو اس کے دشمنوں سے پاک کرنا ہے جو حکمرانوں اور جرنیلوں کی شکل میں پاکستان پر مسلط ہیں اور یہاں اسلامی نظام کے قیام میں رکاوٹ ہیں۔ پاکستانیت کے جذبے کا تو تقاضا ہے کہ یہاں نفاذِ شریعت کے لیے کی جانے والی ہر کوشش کا ساتھ دیا جائے، چاہے وہ زبان سے ہو یا ہاتھ سے، نہ کہ شریعت کے دشمنوں کی تائید کی جائے۔

اسی طرح یہ بھی پروپیگنڈہ کیا گیا کہ پاکستان میں حکومت، فوج اور نظام کے خلاف لڑنے والے وہ لوگ ہیں جو قیامِ پاکستان ہی کے مخالف تھے۔ یہ بھی بے بنیاد الزام ہے۔ پاکستان میں نظامِ کفر کے خلاف قتال کرنے والے تو اسی نظریے کے تحت قتال کر رہے ہیں جس پر پاکستان کا قیام عمل میں آیا تھا، اور یہ اسی تحریکِ پاکستان کا تسلسل ہے جسے چلانے والے علامہ شبیر احمد عثمانی ، علامہ ظفر احمد عثمانی اور مولانا داؤد

غزنوی رحمۃ اللہ علیہم تھے۔[6]

- چوتھی بات یہ ہے کہ پاکستان میں جو مذہبی جماعتیں جمہوری سیاست کا حصہ بنی ہوئی ہیں، انھیں چاہیے کہ عالمی اور علاقائی تناظر کو سمجھیں، اس صدی میں اٹھنے والی اسلامی تحریک یعنی عالمی تحریکِ جہاد کا حصہ بنیں اور جمہوری سیاست کو خیر باد کہیں۔ بھلا وہ جمہوری نظام جس کی داغ بیل دورِ غلامی میں مغربی استبدادی طاقتوں نے ہمارے ملکوں میں رکھی، اس سے اسلام کا نفاذ ممکن ہو گا؟ ہر گز نہیں، یہ جمہوری نظام ہی تو نفاذِ اسلام کی راہ میں رکاوٹ ہے، طاغوت ہے۔ کیا الجزائر اور مصر کے تجربات ہمارے لیے اب بھی عبرت کا باعث نہیں جبکہ اپنی آنکھوں سے ہم نے دیکھ لیا ہے کہ اسلامی جماعتوں کا کیا حال ہوا! یاد رکھیے کہ ہمارے خطے کے بڑے علماء نے ایک دن کے لیے بھی جمہوری سیاست کو 'اصل' نہیں سمجھا تھا۔ علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اگر پارلیمان میں گئے بھی تو جب دیکھا کہ یہاں اسلام کے لیے کوئی قدم نہیں اٹھایا جاسکتا تو اس سے کنارہ کش ہو گئے، مولانا ظفر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے واضح انداز میں ۱۹۷۰ء کے بعد علمائے کرام سے کہا کہ وہ اس جمہوری سیاست سے الگ ہو جائیں اور تبلیغِ احکام کا کام شروع کریں[7]، مولانا یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ نے تو بارہا سمجھایا کہ الیکشن لڑنے اور پارلیمان میں جانے سے اسلام کا کوئی فائدہ نہیں، لہٰذا اس سے اجتناب کیا جائے[8]۔ کیا یہ علماء ہمارے لیے اسوہ نہیں؟

پس یہی وقت ہے کہ معاشرے میں موجود علما، اہلِ مدارس، اہلِ دین دانشوران اور عوام 'پاکستان' میں اسلام کے نفاذ کے لیے حکمرانوں اور جرنیلوں کے خلاف ... اپنی اپنی استطاعت کے بقدر... اٹھ کھڑے ہوں اور

---

[6] ہم یہ وضاحت کرتے چلیں کہ تقسیم ہند کی بابت علماء میں جو اختلاف رائے تھا، ہم اُن دونوں آراء رکھنے والے علماء کا احترام کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ انہوں نے دین کے تقاضوں اور وقت کی مصلحت کے تحت رائے قائم کی۔ البتہ تقسیم کے بعد بھارت کی دین دشمنی اور پاکستان کے حکمرانوں اور جرنیلوں کی دین دشمنی کی وجہ سے ان دونوں ملکوں میں اقامت دین کے لئے مقتدر طبقے کے خلاف قتال کرنا صرف وقت کی ضرورت ہی نہیں شرعی واجب ہے۔

[7] دیکھیے، تذکرۃ الظفر، تالیف: مولانا عبد الشکور ترمذی رحمۃ اللہ علیہ، ترتیب: قمر احمد عثمانی؛ ص ۴۳۰، ۴۳۱، مطبوعات علمی کمالیہ فیصل آباد

[8] دیکھیے بصائر و عبر؛ حصہ دوم، ص ۱۱۲، ۱۱۳، ۱۱۶، ۱۵۲ تا ۱۵۵، ۱۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، مکتبہ بینات کراچی

مجاہدین کی تحریک کے معاون بن جائیں۔ یہی تحریک پاکستان کے بعد کشمیر کی آزادی اور پھر پورے برصغیر میں اسلام کے غلبے کا پیش خیمہ ثابت ہو گی اور پوری دنیا میں جاری تحریک کے ساتھ شامل ہو کر اسلام کے عروج کی منزل کو پہنچے گی ان شاءاللہ۔ وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين!

الحمد لله والصلوٰة والسلام علی رسول الله وعلی آله وصحبه ومن والاه، وبعد

تمہید

پاکستان میں پچھلے دو سالوں کی سیاست پر اگر نگاہ ڈالی جائے تو بہت واضح طور پر ایک شخصیت چھائی ہوئی محسوس ہوتی ہے؛ جنرل راحیل شریف۔ ملک کے 'ظاہری' حکمران (صدر، وزیرِ اعظم، وفاقی کابینہ، صوبائی وزراء و کابینہ) اور عوام کے نمائندے تو بس مہرے نظر آتے رہے اور انھیں چلانے والا جنرل راحیل شریف ہی رہا۔ 'سپہ سالار' کے آہنی ہاتھوں نے دو سالوں میں اس ملک کو کس سمت میں چلایا؟ اس کا مختصر جواب 'اسلام سے دور، امریکہ کے حضور' ہے۔ یعنی مملکتِ پاکستان میں اسلام کے چاہنے والوں کے لیے اسلام پر عمل کرنا ہی دشوار بن گیا ہے، مدارس و مساجد کی کڑی نگرانی ہو رہی ہے، 'دینداری' کو 'شدت پسندی' کا الزام دے کر اہلِ دین کو گرفتار کیا جا رہا ہے، معاشرے میں انھیں کم تر شہری بنایا جا رہا ہے، مجاہدین کو تو واجب القتل قرار دیا جا چکا ہے اور ماورائے عدالت 'جعلی' پولیس مقابلوں میں دیندار نوجوانوں کو چن چن کر شہید کیا جا رہا ہے۔ پوری ملکی مشینری کو جرنیلوں نے یرغمال بنا رکھا ہے۔ ان دو سالوں میں سیاستدان جرنیلی فیصلوں کے سامنے بے بس رہے، فوجی نوعیت کا 'پاکستان آرڈیننس' پاس ہوا، غیر جمہوری 'فوجی' عدالتیں قائم ہوئیں جس کے فیصلوں کو کسی دوسری جگہ چیلنج نہیں کیا جا سکتا اور ایسی عدالتوں میں 'موت' اور 'عمر قید' سے کم تر کوئی سزا نہیں، اظہارِ رائے پر تو اتنی پابندی لگ گئی کہ اسلام کی تعلیمات پر مبنی کتب تو سیکولر نظریات کے خلاف

'منافرت' پھیلانے کے سبب 'ممنوع' ٹھہری ہی، ملکی صحافت بھی ملک میں فوج کے ہر عمل کو 'سب اچھا' کہنے کے علاوہ کچھ نشر کرنے سے قاصر ٹھہری۔ گویا دفاع کے ساتھ ساتھ ملک کی معیشت، امورِ خارجہ وداخلہ، اطلاعات، قانون سازی... سب ہی فوجی جرنیل کے ہاتھ میں نظر آئی اور فوجی جرنیل نے پورا ملک مغربی آقاؤں کی جھولی میں رکھ دیا۔

یہ وہ 'منظر نامہ' ہے جو پاکستان میں پچھلے دو سالوں میں دیکھنے کو ملا۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ اس سارے منظر نامے میں وہ لوگ... جو صبح وشام 'جمہوریت' اور 'پارلیمان کی بالادستی' کے راگ الاپتے تھکتے نہ تھے اور فوج کو ۱۹۷۳ء کا آئین دکھاتے رکتے نہ تھے... چُپ سادھے ہیں، 'سول سوسائٹی' اور 'لبرل عناصر' ...جو ہمیشہ اس ملک میں ہر قسم کی 'آزادی و مساوات' کے لیے سرگرداں رہتے تھے... وہ بھی آنکھیں مُندے بیٹھے ہیں۔ اس ملک میں اسلام کے نفاذ کا نام لیا جائے تو یہ طبقے فوراً... جمہوریت اور آزادی و مساوات کا نعرہ لگاتے... خم ٹھونک کر کھڑے ہو جاتے ہیں، انھیں نفاذِ شریعت کی شکل میں 'حاکمیتِ عوام'، 'ریاستی رِٹ' اور 'حرمتِ آئین' پامال ہوتی نظر آتی ہے، لیکن اگر یہ پامالی فوج کرے اور فوج کی لاٹھی چل رہی ہو تو سب دم دبا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ان طبقات اور فوج میں سب اختلافات کے ہوتے ہوئے ایک قدرِ مشترک ہے اور وہ یہ کہ اس ملک میں اسلام کسی قدم آنے نہ پائے اور 'مغربی تہذیب واقدار' کے نام پر 'دین بیزاری' و 'بے دینی' کو فروغ ملتا رہے۔ اسی مقصد کے تحت اہلِ دین پر زندگی کا دائرہ تنگ کیا جارہا ہے، یہاں تک کہ وہ بھی ان کے کھینچے ہوئے خطوط پر چلنے لگیں اور ان خطوط کو اسلام سے 'متصادم' دیکھنے کی بجائے 'ہم آہنگ' دیکھنے لگیں۔ افسوس کہ بعض لوگوں نے معذرت خواہانہ رویہ اپنا کر یہ کام کرنا شروع کر دیا ہے۔

ان باتوں نے مجبور کیا کہ ہم اپنے خطے کے اہلِ دین اور عام عوام کے سامنے حقیقت واضح کریں۔ یہ بات سمجھائیں کہ پاکستان میں پہلے دن سے مغربی سامراج نے 'جمہوریت' کے نام پر دھوکہ دہی کا مشغلہ اپنایا تاکہ معاشرے کو اس کے ذریعے توڑ کر رکھ دیا جائے، مسلمانانِ پاکستان کے ذہنوں سے اسلامی عقائد و نظریات کو کھرچ کر انھیں مغربی افکار سے بھر دیا جائے، اسلام کے نام پر 'منافقت' اور 'زندقہ' معاشرے میں عام کیا جائے اور لوگوں میں کمزور قیادتیں پیدا کی جائیں، جبکہ قیامِ پاکستان سے ہی پاکستان پر اصل قوت اور اقتدار

برطانیہ وامریکہ نے یہاں کی فوج اور جرنیلوں کو بخشا۔ برطانیہ وامریکہ بخوبی جانتے تھے اور ہیں کہ یہ فوج ہی اس خطے میں اہلِ دین کے اقتدار کو روکنے میں اصل طاقت ہے۔ پاکستان کی پوری تاریخ کا نتیجہ درج ذیل 'تین' باتیں ہیں:

1. پاکستان میں اصل قوت یہاں کی فوج اور اس کے جرنیل ہیں، وہی پاکستان کے اصل حاکم ہیں۔
2. یہ فوج اور جرنیل درحقیقت اس مملکتِ پاکستان میں امریکہ وبرطانیہ کے نمائندے ہیں، وفادار غلام ہیں اور نمک خوار کارندے ہیں۔
3. اس فوج کے جرنیل اسلام دشمن ہیں، دین بیزار ہیں اور پاکستان میں اسلام وشریعت کے نفاذ میں بنیادی رکاوٹ ہیں۔

انھی تین باتوں کو تاریخی طور پر ثابت کرنے کے لیے یہ تحریر لکھی جارہی ہے اور اس تحریر میں انھی لوگوں کے حوالے درج کیے جارہے ہیں جو خود اس گندے کھیل میں شریک تھے، والعیاذ باللہ۔

اللہ تعالیٰ ہمیں حالات کا درست فہم عطا فرمائیں، دشمن کو پہچاننے کی صلاحیت عطا فرمائیں، جس دین کا ہم نے نام لیا ہے، اس پر عمل کرنے والا بنائیں اور جس ملک کو اس دین کے نام پر لیا ہے، اس میں اس دین کا بول بالا کرنے کی توفیق عطا فرمائیں، آمین۔

قیامِ پاکستان اور ابتدائی ریاستی مشینری

قیامِ پاکستان کے حوالے سے دو باتوں کا جاننا از حد ضروری ہے۔

- پہلی بات یہ کہ تحریکِ پاکستان میں کس کس طبقے نے شرکت کی اور کتنی کی؟
- دوسری بات یہ کہ قیامِ پاکستان کی شکل میں ریاستی مشینری کن پُرزوں سے تعمیر ہوئی؟

ریاستِ پاکستان کی آئندہ تاریخ انھی دونوں باتوں کا عکس ہے۔

تحریکِ آزادی ہند... جس نے بعد میں تحریکِ پاکستان کی شکل اختیار کرلی، وہ ڈیڑھ سو سالہ تاریخ کا نام ہے۔ اس کی ابتداء کرنے والوں میں علمائے کرام اور مجاہدینِ دین کے علاوہ کوئی دوسرا شریک نہ تھا، ان کی سعی

کا مقصد کافروں کی حکومت کا انکار وانہدام تھا اور یہ خالص دینی بنیادوں پر کھڑی کی گئی، اور اس کی آخری بڑی کوشش حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کی ’تحریک ریشمی رومال‘ کی صورت میں وجود میں آئی۔ چونکہ یہ کوششیں اپنا حقیقی ثمر حاصل نہ کر سکیں اور دشمن نے بالخصوص ان کے مقابلے کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا تو یہ تحریکات کمزور ہو گئیں۔ ان کے مقابلے میں برطانیہ نے ان کوششوں اور تحریکوں کو پذیرائی حاصل ہونے دی جنھوں نے برطانیہ کے ساتھ ٹکراؤ کی سیاست کی بجائے مفاہمت کی سیاست اپنائی۔ ان تحریکوں کا زمانہ پہلی جنگِ عظیم کے بعد سے دوسری جنگِ عظیم تک تھا۔ اس عرصے میں تحریکِ پاکستان شروع ہوئی۔ یہ تحریک بنیادی طور پر قومیت کے نظریے پر کھڑی کی گئی اور انھی لوگوں نے کھڑی کی جو سر سید کے نظریات کے حامل تھے۔ اس میں دین کو بنیاد نہیں بنایا گیا۔ یہ ’قومیت‘ کا نظریہ آل انڈیا مسلم لیگ نے اپنایا۔ اس کے مقابلے میں کانگریس کی بنیاد بھی قومیت تھی۔ البتہ بعد میں جب تقسیمِ ہند حقیقت کا روپ دھارتی نظر آئی تو علمائے کرام نے بھی اس میں شرکت کی اور ان کی محنت سے بعض قوم پرست لیڈروں نے ریاستِ پاکستان کے وجود کے لیے قومیت کے ساتھ دینی بنیاد کو بھی اپنا لیا۔ یوں تحریکِ پاکستان میں تین بنیادی طبقات شریک ہو گئے:

1. اسلام پسند قوم پرست سیاستدان
2. سیکولر نظریات کے حامل قوم پرست سیاستدان
3. علمائے کرام

علمائے کرام نے تحریکِ پاکستان کی تائید کی لیکن تحریکِ پاکستان کی زمام قوم پرستوں کے ہاتھوں میں رہی جن میں اکثریت سیکولر نظریات کے حامل قوم پرستوں کی تھی۔ مسلم لیگی رہنماؤں کے چند ایک نام تو یقیناً اسلام پسندوں کی فہرست میں آسکتے ہیں، گو ان کے لیے ہم نے اسلام پسند کی اصطلاح استعمال کی ہے کیونکہ وہ اسلام کے بارے میں واجبی سا علم ہی رکھتے تھے اور پاکستان میں اسی قدر اسلام لانے والے تھے جتنا انھیں علم تھا، لیکن اس کی اکثریت سیکولر نظریات کے حامل قوم پرستوں کی تھی۔ قیامِ پاکستان کے بعد یہی سیکولر قوم پرست ہی مسلم لیگ اور پاکستان کی سیاست میں غالب رہے اور ان کے ساتھ وہ جاگیر دار شامل ہو گئے جو برطانوی دور میں بالخصوص انگریزوں کے وفادار خدّام تھے۔ محمد علی جناح کی پہلی کابینہ پر نظر ڈالی جائے تو یہ

حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔

علمائے کرام نے قیامِ پاکستان سے پہلے مسلم لیگ کی بھرپور تائید کی اور مسلمان عوام کو ان کے حق میں تیار بھی کیا کیونکہ مسلم لیگ نے وعدہ کیا تھا کہ قیام کے بعد پاکستان کا نظام اسلامی احکامات کے مطابق چلایا جائے گا۔ لیکن قیامِ پاکستان کے معاً بعد سیاستدانوں نے علمائے کرام کو دھوکہ دینا شروع کر دیا اور جلد ہی انھیں ملکی سیاست سے بے دخل کر دیا۔ پاکستان کے پہلے دو گورنر جنرلز اور دو وزرا اعظم کو تاریخ دان کسی درجے میں اسلام پسندوں کے زمرے میں شامل کر سکتے ہیں ...جبکہ پاکستان میں حقیقی اسلام کا نفاذ ان کا مطمحِ نظر بھی نہ تھا...، لیکن تیسرے گورنر جنرل اور تیسرے وزیرِ اعظم کا تو اسلام کے ساتھ دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ لیاقت علی خان کے قتل اور خواجہ ناظم الدین کی برطرفی کے ساتھ ہی پاکستان بنانے والی مسلم لیگ کی قیادت پاکستانی سیاست سے بے دخل ہو چکی تھی اور یہ محض چار سالوں کے اندر ہو گیا۔ ان چار سالوں میں بھی کام وہی ہوئے جو پاکستان کی ’ریاستی مشینری‘ نے کیے۔ اب یہ جانیے کہ قیامِ پاکستان کے ساتھ ہی ریاستی مشینری کن پرزوں سے تعمیر ہوئی۔

برطانیہ نے اپنے دور میں ہندوستان کا نظام چلانے کے لیے ’انڈین سول سروس‘ (ICS) کا نظام رائج کیا تھا اور اپنے دفاع کے لیے مقامی لوگوں پر مشتمل ’رائل انڈین آرمی‘ بنائی تھی۔ تقسیمِ ہند کے وقت انھی دونوں اداروں کو تقسیم کر کے دونوں ملکوں پاکستان اور بھارت کو دے دیا گیا۔ یہ سول سرونٹ جو برطانوی دور میں برطانیہ کے وفادار رہے اور ان کے تربیت یافتہ تھے، انہوں نے ہی پاکستان کی ’ریاستی مشینری‘ کو وجود دیا۔ دوسری طرف پاکستان کی فوج بھی انھی لوگوں پر مشتمل تھی جو اس سے قبل ’رائل انڈین آرمی‘ میں برطانیہ کی وفاداری میں پلے تھے اور ان کا نمک کھایا تھا۔

بلکہ مزے کی بات یہ ہے کہ برطانوی دور کے بہت سے سول سرونٹ ہی پاکستان کی ابتدائی سیاست میں بھی شامل ہو گئے اور حکمرانی کرتے رہے۔ ان میں اسکندر مرزا، ملک غلام محمد، چوہدری محمد علی، ملک فیروز خان نون کے نام سرِ فہرست ہیں۔

معلوم ہوا کہ جن مسلمانوں نے لا الہ الا اللہ کے نام پر قربانیاں دیں اور جن علمائے کرام نے لا الہ الا اللہ

کے نفاذ کے وعدے پر مسلم لیگ کا ساتھ دیا، وہ سب قیامِ پاکستان کے ساتھ بے اثر کر دیے گئے۔ اور پاکستان فرنگی غلاموں کے ہاتھوں میں آ گیا اور ان میں سے بھی جو فرنگیوں کے سب سے بااعتماد غلام تھے، ان کے شکنجے میں آ گیا۔

پاکستانی فوج کا قیام اور پاکستان کے ابتدائی سالوں میں اس کا کردار

یہ بات تو بیشتر پاکستانیوں کے علم میں ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد نئے سرے سے مسلمانوں کو بھرتی کر کے اس ملک کی فوج نہیں بنائی گئی، بلکہ ’رائل انڈین آرمی‘ ہی کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ایک حصہ ’پاکستانی فوج‘ کے نام پر پاکستان کو دے دیا گیا۔ یہ بھی ویسی ہی بندر بانٹ تھی جس طرح ریڈ کلف باؤنڈری کمیشن کی سرحد بندی اور ماؤنٹ بیٹن کی سرکردگی میں اثاثوں کی تقسیم۔

’رائل انڈین آرمی‘ برطانیہ کی عظمت کی علامت تھی۔ اسی رائل انڈین آرمی کے بل بوتے پر برطانیہ نے پہلی جنگِ عظیم میں خلافتِ عثمانیہ اور جرمنی کو شکست دی، عراق، شام و فلسطین اور مصر پر قبضہ کیا۔ اسی رائل انڈین آرمی کے جوانوں نے دوسری جنگِ عظیم میں برطانیہ کی عزت بچائی جبکہ ہٹلر اور جاپانیوں کے ہاتھوں ابتدائی سالوں میں اسے ہزیمت کا سامنا تھا۔ اسی رائل انڈین آرمی کے بل بوتے پر برطانیہ نے ہندوستان پر بھی قبضہ برقرار رکھا اور یہاں آزادی کے لیے اٹھنے والی تحریکات کو کچلا۔ چنانچہ رائل انڈین آرمی کے افسر و جوان برطانیہ اور امریکہ دونوں ہی کے انتہائی معتمد غلام اور وفادار نوکر تھے۔ اس بنیاد پر ’پاکستانی فوج‘ بھی قیامِ پاکستان کے بعد برطانیہ و امریکہ کا سب سے زیادہ معتمد ادارہ تھا۔ برطانیہ کو سیاستدانوں سے زیادہ بیوروکریسی اور بیوروکریسی سے بھی زیادہ پاکستانی فوج پر اعتماد تھا۔ اس اعتماد کی بدولت آغاز سے ہی اپنے جرنیلی کارندوں کو برطانیہ و امریکہ نے پاکستانی سیاست میں داخل رکھا اور ان کے ذریعے پورے پاکستان پر اپنا تسلط قائم رکھا۔

نوزائدہ پاکستانی فوج کے ساتھ سب سے پہلے برطانیہ نے یہ کیا کہ ایک عرصے تک انگریز افسروں نے ہی پاکستانی افواج کی قیادت کی۔ ۱۹۵۱ء تک بری فوج، ۱۹۵۲ء تک بحریہ اور ۱۹۵۷ء تک فضائیہ کے کمانڈر انچیف سب انگریز افسران تھے۔ بعد میں جونیئر پاکستانی افسروں کو جلد ترقیاں دے کر اوپر لایا گیا اور انھیں خصوصی

طور پر مغربی ملکوں میں ٹریننگ دی گئی۔ جب برطانیہ وامریکہ کو تسلی ہو گئی کہ یہ اب ’اپنے‘ ہیں تو انھیں پاکستانی افواج کی قیادت کے لیے پاکستان کے حوالے کر دیا گیا۔ جنرل ایوب خان جو پاکستانی فوج کا پہلا پاکستانی کمانڈر انچیف بنا، اپنی تقرری کے حوالے سے خود اپنی خود نوشت میں لکھتا ہے:

General Gracey took the announcement in very good part. I was appointed Deputy Commander-in-Chief so that I should be able to make myself familiar with the work. I went to Germany and England on a short visit to study military establishments.[1]

”جنرل گریسی (جو اس وقت پاکستانی فوج کا کمانڈر انچیف تھا) نے میری تقرری کا خوشگوار اعلان کیا۔ مجھے نائب کمانڈر انچیف بنا دیا گیا تاکہ میں خود کو کام کے ساتھ ہم آہنگ کر سکوں۔ میں مختصر دوروں پر جرمنی اور انگلینڈ گیا تاکہ فوجی نظم ونسق سیکھ سکوں“۔

جنرل ایوب خان کو جرمنی اور انگلینڈ اسی لیے بھیجا گیا تاکہ اسے اچھی طرح مغربی رنگ میں رنگ دیا جائے، اور ایسا ہی ہوا۔ اسی جنرل ایوب خان نے آگے چل کر پاکستانی فوج کا پورا نظم ونسق امریکی انداز میں منظم کیا، جس کا ذکر آگے مضمون میں آئے گا۔ جنرل ایوب خان زندگی بھر رائل انڈین آرمی کے نمک حلالی کرتا رہا۔ یہاں حوالے کے لیے جنرل ایوب خان کی وہ عبارت ذکر کرنا فائدے سے خالی نہیں جو اس نے وزیرِ اعظم فیروز خان نون کو اس وقت لکھی جب ۹ جون ۱۹۵۸ء کو اسے فیروز خان نون نے مدتِ ملازمت میں توسیع دی۔

Grateful for your message of appreciation and encouragement on my extension of tenure. Personally I would have been just as happy to retire as I would be in further serving this magnificent army the building of which has been my life long ambition. In any case I have

---

[1] Friends, not Masters، ص ۳۵

eaten its salt for thirty one years and everything in me is due to it and belongs to it.[2]

”میری مدتِ ملازمت کی توسیع پر آپ کی حوصلہ افزائی کے پیغام کا میں شکر گزار ہوں۔ شخصی طور پر میں ریٹائر ہونے پر جس قدر خوش ہوتا، اسی قدر میں اس پر خوش ہوں کہ مجھے اس عظیم فوج میں مزید خدمت کا موقع دیا جا رہا ہے، جس فوج کی تعمیر میری زندگی بھر کا مشن ہے۔ جو بھی معاملہ ہو (ریٹائرمنٹ یا توسیع، میں یہ اعتراف کرتا ہوں کہ) میں نے پچھلے اکتیس سالوں 3 سے اس کا نمک کھایا ہے اور میں جو کچھ ہوں اسی فوج کی وجہ سے ہوں اور اسی کی طرف منسوب ہوں“۔

ملاحظہ کیجیے کہ یہاں جنرل ایوب خان نے واضح اعتراف کیا ہے کہ وہ جس فوج کے نمک حلال ہیں، وہ رائل انڈین آرمی سے چلتی ہوئی پاکستانی فوج بنی ہے۔ اور جو نمک انھوں نے پاکستان بننے سے پہلے کھایا ہے، وہ اسے حلال کرنے کا بھی دم بھر رہے ہیں۔

یوں برطانیہ نے پاکستانی فوج کو اس قابل بنا دیا کہ جب کبھی ملک میں حالات برطانیہ و امریکہ کے مطابق نہ چل رہے ہوں تو فوج انھیں درست سمت میں چلاتی رہے اور ملکی سیاست مستقل فوج کے زیرِ اثر امریکی و برطانوی خطوط پر گامزن رہے۔ یہ ایسی بات ہے کہ جس کی صداقت کے لیے کوئی حوالہ نہ بھی ہو تو تاریخ خود بہت مستند حوالہ ہے، گو ہمارے پاس حوالوں کی بھی بھرمار بلکہ طومار ہے۔ پہلے دن سے آج تک ملکی سیاست فوجی جرنیلوں کے نہ صرف زیرِ اثر رہی بلکہ دو تہائی تاریخ تو براہِ راست فوجی اقتدار کی نظر ہوئی۔ مصنف ’ہربرت فیلڈ مین‘ (Herbert Feldman) نے اپنی کتاب The End and The Beginning: Pakistan میں پاکستانی سیاست کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

---

[2] Friends, not Masters، ص ۶۳

[3] یاد رہے کہ ایوب خان کو ۲ فروری ۱۹۲۸ء میں رائل انڈین آرمی میں بطور سیکنڈ لیفٹیننٹ کمیشن ملا تھا۔ یوں اسے ’اکتیس‘ سال ہوئے تھے۔

Whenever it was felt in GHQ that things were not going according to the taste and opinion of senior officers, the armed forces (in fact the army alone) would move in or contrive to do so.[4]

"جب بھی جی ایچ کیو میں یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ حالات سینئر فوجی افسروں کے مزاج اور خیال کے مطابق نہیں جارہے، افواجِ پاکستان (درحقیقت صرف بری فوج) حرکت میں آجاتی ہے یا مداخلت کے لیے تدبیر پیدا کرتی ہے"۔

ابتدائی سالوں کی ملکی سیاست میں فوج کی دخل اندازی

ریاستِ پاکستان کو قیام کے ساتھ ہی بہت سے جوہری مسائل کا سامنا کرنا پڑا... جیسا کہ کسی بھی نوزائدہ ریاست کو متوقع ہوتے ہیں... دراں حالیکہ ابھی تک ریاست کے پاس منظم ڈھانچہ موجود نہیں تھا۔ ریاستی ادارے خود پیدائش کے مرحلے میں تھے۔ قیام کے وقت سب سے مضبوط ادارہ وہ 'فوج' تھی جو پاکستان کے حصے میں آئی تھی۔ اس کالازمی نتیجہ یہ نکلا کہ یہی ادارہ ریاست کے داخلی مسائل میں بھی اتر آیا۔ اس کے ساتھ ساتھ چونکہ ریاست کو خارجی سطح پر بھی بھارت کی جارحیت کا سامنا تھا، سو اس کا حل بھی یہی ادارہ تھا۔ چنانچہ

۱۔ مہاجرین کی آبادکاری

۲۔ فسادات کی روک تھام

۳۔ خودمختار ریاستوں کا الحاق

۴۔ سرحدوں کی حفاظت

۵۔ کشمیر جنگ

... سب میں پاکستانی فوج نے کردار سنبھال لیا۔ یوں قیام کے ساتھ پاکستانی فوج کو دوسرے تمام اداروں پر برتری حاصل ہوگئی اور برطانیہ وامریکہ کو کمزور ریاست میں فوج کو مستحکم کرنے کا بہترین موقع دستیاب ہوگیا۔

---

[4] The end and the beginning: Pakistan، ص ۱۱، بحوالہ جرنیل اور سیاستدان تاریخ کی عدالت میں، ص ۸۱

ابتدائی سالوں میں سیاستدانوں کے مقابلے میں فوجی اثر ورسوخ

ابتدائی سالوں میں ہی فوج کا سیاستدانوں کے مقابلے میں اثر ورسوخ بہت واضح شکل میں سامنے آنے لگا۔ اس کی پہلی مثال اس وقت دیکھنے کو ملی جب محمد علی جناح نے اکتوبر ۱۹۴۷ء میں پاکستانی فوج کے کمانڈر انچیف جنرل ڈگلس گریسی (Douglas Gracey) کو کشمیر کی طرف فوج کشی کا حکم دیا تو اس نے انکار کر دیا۔ اور اگلے ہی روز بھارت وپاکستانی افواج کے سپریم کمانڈر جنرل آکن لیک (Auchinleck) نے آکر جناح سے آرڈر واپس کروالیا۔

میجر جنرل شاہد حامد ...جو اس وقت جنرل آکن لیک کا پرائیویٹ سیکرٹری تھا... نے اپنی کتاب Disastrous Twilight میں اس واقعے کے متعلق لکھا:

On 27th October he ordered Gracey to move troops into Jammu and Kashmir and to seize Srinagar and the Banihal pass. Gracey replied that he could not comply with the order and must report the matter to Auchinleck as compliance would entail the issue of 'Stand Down Order No. 2' which meant the withdrawal of the British officers from the Pakistan Army. According to Gracey's private secretary, Wilson, Mountbatten rang up Gracey and threatened that if he moved any troops to Kashmir he would ensure that he would not get his knighthood.[5]

"۲۷ اکتوبر ۱۹۴۷ء کو انہوں (جناح) نے گریسی کو حکم دیا کہ فوج کو جموں اور کشمیر بھیجے اور سری نگر اور درہ بانیہال پر قبضہ کرلے۔ گریسی نے جواب دیا کہ وہ احکامات کی تعمیل نہیں کر سکتا، اور اسے یہ

---

[5] Disastrous Twilight، ص ۲۷۷، بحوالہ جرنیل اور سیاستدان، ص ۳۸، ۳۹

معاملہ آکن لیک کو رپورٹ کرنا لازمی ہے۔ احکامات کی تعمیل کا لازمی نتیجہ ’سٹینڈ ڈاون آرڈر نمبر ۲‘ کا اطلاق ہو گا۔ جس کا مطلب پاکستان آرمی سے برطانوی افسروں کی علیحدگی تھا۔ گریسی کے پرائیویٹ سیکرٹری ولسن کے مطابق ماؤنٹ بیٹن نے گریسی کو فون کیا اور دھمکی دی کہ اگر اس نے فوج کو کشمیر کی طرف روانہ کیا تو وہ یقین کر لے کہ اسے نائٹ ہڈ کا خطاب نہیں ملے گا“۔

ابتداء میں چونکہ دونوں ملکوں کی افواج کے کمانڈر انچیفس کے اوپر ایک سپریم کمانڈر بھی موجود تھا جو برطانوی جنرل آکن لیک تھا... جو اس سے قبل رائل انڈین آرمی کا کمانڈر انچیف تھا...اور دونوں ملکوں کی افواج اسی کے زیرِ کمان تھی۔ اسی لیے گریسی نے آکن لیک سے رابطہ کیا اور ساتھ ہی ماؤنٹ بیٹن نے بھی گریسی کو دھمکا کر روک دیا۔ یوں جناح کے احکام کی تعمیل نہ ہوئی، بلکہ اگلے روز آکن لیک نے آکر باقاعدہ جناح سے احکام واپس بھی کروالیے۔ پاکستان بننے کے دوسرے ماہ کی یہ سرگزشت ہی پاکستان کی آئندہ کی تاریخ ہے۔ پاکستان میں حکم وہی چلا ہے، جو برطانیہ وامریکہ نے چاہا ہے اور اس رکاوٹ کے لیے مقامی سطح پر کردار یہاں کی فوج نے ادا کیا ہے۔ سیاستدانوں کی حیثیت ہمیشہ مہروں کی رہی ہے۔

۱۹۴۸ء میں جنرل ایوب خان... جو اس وقت میجر جنرل تھا... مشرقی پاکستان میں جی او سی[6] کے طور پر تعینات تھا۔ سیاسی طور پر حالات کشیدہ تھے، اردو کے بطور سرکاری زبان متعین ہونے کے سبب بنگالی عوام اور طلبہ حکومت کی مخالفت کر رہے تھے اور بنگالی زبان کو بھی سرکاری زبان کا درجہ دینے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ اس سال جنوری میں طلبہ اپنے مطالبات کے لیے احتجاج کر رہے تھے اور اسمبلی پر حملہ کرنا چاہتے تھے۔ اسمبلی کا اجلاس جاری تھا، وزیرِ اعلیٰ خواجہ ناظم الدین نے تقریر کرنی تھی۔ خواجہ ناظم الدین نے صورتحال دیکھتے ہوئے جی او سی میجر جنرل ایوب خان سے صورتحال کنٹرول کرنے کی درخواست کی۔ میجر جنرل ایوب خان نے اسمبلی کو گھیرے میں لے لیا اور احتجاج کو رفع دفع کیا۔ اس واقعے نے ایک تو سیاستدانوں کی کمزوری کو واضح کر دیا کہ ملکی حالات کا کنٹرول فوج کے بغیر ممکن نہیں۔ دوسری طرف جس انداز میں ایوب خان نے احتجاج کو

---

[6] General Officer Commanding (GOC)

رفع دفع کیا، وہ بھی اس بات کا غماز تھا کہ ملکی حالات کے کنٹرول کے لیے فوج قوت کے استعمال سے گریز نہیں کرے گی ... جس کی عملی مثالیں آئندہ سالوں میں حقیقت کا روپ دھارتی رہیں۔

جنوری ۱۹۴۸ء کے احتجاج میں محمد علی بوگرہ بھی میں شامل تھا... جو بعد میں مملکت کا تیسرا وزیرِ اعظم بھی بنا... اور اس وقت وہ اپوزیشن لیڈر تھا۔ میجر جنرل ایوب خان نے جی او سی کی حیثیت میں اسے یہ الفاظ تک کہہ دیے:

Are you looking for a bullet?[7]

''کیا تم گولی کا انتظار کر رہے ہو؟''

یہ بات خود ایوب خان نے اپنی کتاب میں لکھی ہے۔ مملکتِ پاکستان میں سیاستدانوں کے لیے فوج کے یہ ریمارکس کافی رہے اور پوری تاریخ میں اسی دھمکی کے بل بوتے پر پاکستانی فوج نے ملک کو اپنے شکنجے میں رکھا۔

ابتدائی سالوں میں پاکستانی سیاست 'امریکی' مفادات کے زیرِ اثر

قیامِ پاکستان کے بعد ملکی سیاست کی ایک اور اہم بات یہ تھی کہ ابتداء میں ہی پاکستانی سیاست کا 'قبلہ' امریکہ متعین ہو گیا تھا۔ چونکہ دوسری جنگِ عظیم کے بعد برطانیہ کی بجائے قوت امریکہ کے ہاتھ میں چلی گئی اور خود برطانیہ بھی امریکہ کے ساتھ منسلک ہو گیا، تو پاکستان کے تناظر میں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستانی سیاست بھی ابتداء میں برطانیہ کے زیرِ اثر رہنے کے بعد امریکہ کے ساتھ نتھی ہو گئی۔ عالمی حالات کے تناظر میں بھارت نے اپنا تعلق روس سے جوڑا تو پاکستان امریکی گود میں آ گیا۔ اس وقت کا امریکہ نے گود لیا تو آج تک نہ چھوڑا۔

ملک کے پہلے وزیرِ اعظم لیاقت علی خان نے مئی ۱۹۵۰ء میں امریکہ کا دورہ کیا اور یہ امریکہ کے ساتھ تعلقات کی ابتداء تھی۔ مالی امداد پر ہر قسم کے تعاون کی یقین دہانی کرائی گئی۔ نتیجے میں امریکہ نے روس کے خلاف فضائی اڈے حاصل کیے اور کوریا کی جنگ میں پاکستانی فوج کی عملی شرکت کا مطالبہ کیا۔

---

[7] Friends, not Masters، ص ۳۰

جون ۱۹۵۱ء میں امریکہ اور کوریا کی جنگ ہوئی۔ جس میں پاکستان نے امریکہ کے ساتھ تعاون کیا، کوریا میں اقوامِ متحدہ کے ملٹری ایکشن کو سپورٹ کیا اور کوریا میں پاکستانی فوج کا ایک بریگیڈ بھیجنے میں رضامندی ظاہر کی جبکہ بھارت نے انکار کر دیا۔ امریکہ نے پاکستانی فوج کو جدید اسلحہ سے لیس کرنے کا وعدہ کیا۔ جب پاکستان نے واشنگٹن سے مطالبہ کیا کہ وہ بھارت کے خطرے کے پیشِ نظر پاکستان کو دفاع اور سلامتی کی گارنٹی دے، تو اس پر امریکہ انکاری ہو گیا۔ امریکہ کے انکار پر پاکستان نے کوریا میں فوج بھیجنے کا فیصلہ تو تبدیل کر دیا لیکن اقوامِ متحدہ کی کارروائیوں کی سیاسی حمایت کی۔ کوریا کی جنگ کے دوران بھارت نے پاکستانی پنجاب کی سرحد پر اپنی فوجیں تعینات کر دیں۔ پاکستان کے پاس دفاع کی فوجی صلاحیت نہیں تھی، لہٰذا چار وناچار حکمران خوف زدہ ہو کر امریکہ کی جانب دیکھنے لگے۔ امریکہ نے پاکستان کے ساتھ تعاون کیا[8]۔ اسی زمانے میں امریکی صدر ٹرومین (Harry S. Truman) نے پاکستان کو امریکہ کا 'فرنٹ لائن' اتحادی قرار دے دیا۔

یہ سلسلہ یہاں نہیں رکا، بلکہ اگلے سالوں میں مزید گہرا ہوتا گیا۔ اس کے بعد ۱۹۵۵ء میں بغداد پیکٹ (Baghdad Pact)...جو بعد میں 'سینٹو' (Cento)[9] کے نام سے معروف ہوا... میں پاکستان نے ایران، عراق اور ترکی کے ہمراہ شرکت کی۔ یہ معاہدہ خالص امریکی معاہدہ تھا جس کا مقصد روس کے لیے حصار قائم کرنا تھا۔ اس معاہدے میں پاکستان نے دستخط کیے اور اس کے نتیجے میں امریکہ سے امداد حاصل کی۔ اس معاہدے کے تحت پاکستان نے امریکہ کو پشاور ایئر بیس کا کنٹرول فراہم کیا جہاں سے امریکہ روس کی نگرانی کے لیے U-2 طیارے اڑاتا تھا۔

اس کے علاوہ اسی سال پاکستان نے ایک دوسرے امریکی معاہدے 'سیٹو' (Seato)[10] میں بھی شمولیت اختیار کی۔ گو ان دونوں معاہدوں کی بدولت امریکہ کو روس کے مقابلے میں کچھ زیادہ فائدہ نہ ہوا اور نہ پاکستان

---

[8] جرنیل اور سیاست دان تاریخ کی عدالت میں از قیوم نظامی، ص ۴۴

[9] Central Treaty Organization

[10] South East Asia Treaty Organization

کو زیادہ فوائد حاصل ہوئے۔ البتہ جب تک یہ معاہدے قائم رہے، پاکستان امریکی امداد سے لطف اندوز ہوتا رہا اور امریکہ نے پاکستان پر اپنی اجارہ داری قائم رکھی۔ ان دونوں معاہدوں میں پاکستان کو دھکیلنے میں بنیادی کردار پاکستانی فوج کے دو جرنیلوں میجر جنرل اسکندر مرزا اور کمانڈر انچیف جنرل ایوب خان کا تھا، کیونکہ پاکستان کی ابتدائی سیاست میں ان دونوں کے پاس مرکزی قوت تھی اور یہ دونوں برطانوی وامریکی مفادات کے محافظ تھے۔

پاکستان پر جرنیلوں کا اقتدار

اوپر بیان کردہ تفصیلات سے بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ کس انداز میں قیامِ پاکستان کے ساتھ ہی برطانیہ وامریکہ نے پاکستانی سیاست کو چلایا اور کس طرح فوج کو سیاسی معاملات میں داخل کیا۔ اب یہاں ذرا تفصیل سے جرنیلوں کا تذکرہ کرتے ہیں جو پاکستانی سیاست میں بنیادی کردار ادا کرتے رہے اور جن کے ہاتھ میں اقتدار رہا۔ ان کے اقتدار کو واضح کرنے کے ساتھ ساتھ ہم ان کے اقدامات، ان کے ذاتی کردار اور ان کی امریکہ غلامی کو بھی واشگاف کریں گے، تاکہ پاکستان کے عوام اور بالخصوص یہاں کے دینی طبقے... جنہوں نے یہاں لا الہ الا اللہ کا خواب دیکھا تھا اور جس خواب کو وہ ابھی بھی آنکھوں میں سجائے بیٹھے ہیں... کے سامنے پاکستان میں لا الہ الا اللہ کے حقیقی دشمنوں کی تصویر واضح ہوجائے اور وہ ان کے مقابلے میں اٹھ کھڑے ہوں۔

میجر جنرل اسکندر مرزا

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء سے لے کر اکتوبر ۱۹۵۸ء تک پاکستان کے ابتدائی گیارہ سالوں میں قوت کا مرکز رہنے والا شخص 'میجر جنرل اسکندر مرزا' تھا... جو قیام کے وقت ڈیفنس سیکرٹری کے طور پر پہلی کابینہ میں شامل ہوا اور پھر کئی وزارتوں سے ہوتا ہوا اگست ۱۹۵۵ء میں ملک کا گورنر جنرل اور پھر مارچ ۱۹۵۶ء میں پاکستان کا پہلا صدر بنا۔

اسکندر مرزا کا تعارف

اسکندر مرزا اس ’میر جعفر‘ کی نسل سے ہے جس کے بل بوتے پر انگریز نے ’پلاسی کی جنگ‘ میں ’سراج الدولہ‘ کو شکست دی تھی جس کے بعد برصغیر میں برطانیہ کے اقتدار کا آغاز ہوا تھا۔ یہ اسکندر مرزا ’رائل انڈین آرمی‘ کا چشم و چراغ تھا۔ اس نے برطانیہ میں بنیادی عسکری ادارے ’رائل ملٹری کالج سینڈ ہرسٹ‘ (Royal Military College, Sandhurst) میں تربیت حاصل کی اور قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ یہ برصغیر کا ’پہلا‘ مقامی شخص تھا جو اس کالج سے گریجویٹ بنا۔ تقسیمِ ہند سے پہلے اس نے رائل انڈین آرمی میں بیش بہا خدمات انجام دیں۔ یہ ۱۹۲۰ء کی ’وزیرستان جنگ‘ میں محسود اور وزیر مجاہدین کے خلاف انگریز کی طرف سے شریک ہوا۔ اس کی کارکردگی سے خوش ہو کر فرنگیوں نے اسے عسکری امور سے نکال کر ۱۹۲۶ء میں ’انڈین پولیٹیکل سروس‘ میں شامل کر کے سرحد کا ’اسسٹنٹ کمشنر‘ بنادیا۔ بعد ازاں ۱۹۳۸ء میں اسے قبائلی علاقوں کا ’پولیٹیکل ایجنٹ‘ بھی بنایا گیا جہاں یہ ۱۹۴۵ء تک فائز رہا۔ اس کے بعد ۱۹۴۶ء تک سرحد کا ’پولیٹیکل ایجنٹ‘ تھا۔ یہ واضح رہے کہ اس سارے سرکاری عمل کے دوران وہ بدستور رائل انڈین آرمی کا افسر رہا اور ۱۶ جولائی ۱۹۴۶ء کو اسے ’لیفٹیننٹ کرنل‘ کے عہدے پر ترقی دی گئی۔ اس شخص کی شاندار کارکردگی دیکھتے ہوئے برطانیہ نے فیصلہ کیا کہ اسے ۱۹۴۶ء میں پورے ہندوستان کے لیے ’جوائنٹ ڈیفنس سیکرٹری‘ کا عہدہ دیا جائے۔ اسی عہدے پر موجود رہتے ہوئے تقسیمِ ہند کے وقت تاجِ برطانیہ نے اس شخص کو یہ خدمت بھی سونپی کہ وہ رائل انڈین آرمی کو انڈیا اور پاکستان کی آرمی میں تقسیم کرے۔ برطانیہ کا یہ دیرینہ اور وفادار خادم پاکستان بننے کے بعد پاکستان کا پہلا ’ڈیفنس سیکرٹری‘ بنا[11] اور ملٹری پولیس کا ’جی او سی‘ (GOC) بنا۔ یہی شخص پاکستان کے ابتدائی گیارہ سالوں کی سیاست کا بنیادی کردار ہے جس کی جھلکیاں اس مضمون میں آگے دیکھنے کو ملیں گی۔

یہاں ایک مرتبہ ٹھہر کر سوچیے کہ اگر برطانیہ کا یہی وفادار غلام اور فوجی... جس نے تحریکِ آزادیٔ ہند کے کرداروں (جن میں ’شہزادہ فضل دین‘ اور ’فقیر ایپی‘ شامل ہیں) کے خلاف عسکری اور سرکاری میدانوں میں

[11] درج بالا معلومات دائرہ معارف ویکی پیڈیا سے لی گئی ہیں۔ en.wikipedia.org/wiki/iskander mirza

اپنی کارکردگی کا مظاہرہ کیا اور اپنے فرنگی آقاؤں کی خوب نمک حلالی کی...یہی نوزائدہ پاکستان کے ابتدائی گیارہ سالوں میں پاکستان کا حاکم رہا تو خود بخود اندازہ ہو جانا چاہیے کہ ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کس قدر آزاد ہوا تھا؟!

قیامِ پاکستان کے بعد اسکندر مرزا کا کردار

حکومتِ پاکستان کی طرف سے صدورِ پاکستان کی تاریخ پر مشتمل ویب سائٹ president.gov.pk میں اسکندر مرزا کے حوالے سے درج ہے:

After the establishment of Pakistan in 1947, Prime minister Liaquat Ali Khan appointed Mirza as the first Defence Secretary, one of the most important government positions. He oversaw the Indo-Pakistan war of 1947, and the Balochistan conflict in 1948.

"۱۹۴۷ء میں قیامِ پاکستان کے بعد، وزیرِ اعظم لیاقت علی خان نے مرزا کو پہلا سیکرٹری برائے دفاع مقرر کیا، جو ایک انتہائی اہم سرکاری عہدہ ہے۔ اسی نے ۱۹۴۷ء کی پاکستان بھارت جنگ کی نگرانی کی اور ۱۹۴۸ء میں بلوچستان میں فوج کشی کی نگرانی کی"۔

حقیقت یہ ہے کہ پاکستان میں میجر جنرل اسکندر مرزا برطانیہ اور امریکہ کا 'واچ ڈوگ' تھا اور انھی کے بل بوتے پر وہ پاکستانی سیاست میں اول روز سے ہی اپنی حیثیت میں موجود تھا۔ خان لیاقت علی خان کی مجبوری تھی کہ وہ اسکندر مرزا کو ریاستی معاملات میں آگے رکھیں اور وہ بیشتر معاملات میں اسکندر مرزا سے ہی مشورہ لیتے تھے۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ لیاقت علی خان کو ملکی سیاست کے بعض بڑے ناموں مثلاً غلام محمد، مشتاق گورمانی، ممتاز دولتانہ وغیرہ پر اعتماد نہ تھا۔ اسکندر مرزا اس قدر معاملات میں دخیل تھا کہ اسی کے مشورے پر سینئر افسروں کو چھوڑتے ہوئے لیاقت علی خان نے پاکستانی فوج کا کمانڈر انچیف 'ڈگلس گریسی' کے بعد 'جنرل ایوب خان' کو بنایا تھا۔

لیاقت علی خان کے قتل کے بعد نئے وزیر اعظم کے انتخاب کے لیے نمایاں نام سردار عبد الرب نشتر کا تھا، لیکن چونکہ وہ دینی ذہنیت کے حامل تھے، اس بنیاد پر انھیں وزیر اعظم نہ بننے دیا گیا اور اس میں بھی بنیادی کردار اسکندر مرزا کا تھا۔ اس حوالے سے دارۂ معارف Wikipedia میں درج ہے:

Nishtar was considered a serious contender for the post of Prime Minister after Liaqat Ali Khan's assassination. His appointment was blocked by senior secularists and liberal officials including the future President Iskander Mirza because of Nishtar's conservative and Islamic views.

"لیاقت علی خان کے قتل کے بعد سردار نشتر وزارتِ عظمیٰ کے عہدے کا بااہل امیدوار سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اس کی تقرری سینئر سیکولر اور لبرل عہدیداران کی طرف سے روک دی گئی جن میں مستقبل کا صدر 'اسکندر مرزا' شامل تھا، اور اس تقرری کے روکنے کا سبب نشتر کے قدامت پسند اور اسلام پسند نظریات تھے"۔

خواجہ ناظم الدین کا دورِ وزارتِ عظمیٰ

لیاقت علی خان کے بعد اسکندر مرزا اور برطانیہ کی مرضی سے اکتوبر ۱۹۵۱ء میں خواجہ ناظم الدین کو گورنر جنرل کے عہدے سے ہٹا کر وزیرِ اعظم بنا دیا گیا۔ اس کی یہ وجہ بخوبی سمجھ آتی ہے کہ ایک تو وہ مسلم لیگ کے بنیادی لوگوں میں سے تھے، لیکن ساتھ ساتھ انتہائی کمزور طبیعت کے انسان تھے جس کے ہوتے ہوئے بآسانی اپنی مرضی چلائی جاسکتی ہے۔ ایسا ہی ہوا اور اسکندر مرزا بڑی دیدہ دلیری سے کاروبارِ حکومت اپنی مرضی سے چلاتا رہا اور بیشتر فیصلوں میں یہی شخص داخل رہا۔ کرامت اللہ غوری نے ۱۱ فروری ۲۰۰۶ء کے 'ڈان' اخبار میں بیوروکریٹ جناب 'قمر الاسلام' کی روایت سے یہ واقعہ نقل کیا...جو خود اس واقعے کے عینی گواہ ہیں... کہ:

The time was 1953 and the cabinet of Khawaja Nazimuddin was convened to decide the line of action in regard to the sectarian

violence then consuming Lahore. In the middle of a heated debate, Iskander Mirza, then cabinet secretary, rose and left the room without seeking the PM's permission. He returned to the cabinet session ten minutes later and announced to its participants not to bother themselves anymore as he had spoken to Lt. Gen. Azam Khan, Lahore's corps commander who was all primed to declare martial law in the city next morning. That ended the discussion. Neither the PM nor anybody else dared challenge Mirza over his arbitrary decision or insolent behavior.[12]

"۱۹۵۳ء کا وقت تھا اور خواجہ ناظم الدین کی کابینہ میں لاہور کو معطل کرنے والے فرقہ وارانہ فساد[13] کے بارے میں عملی خطوط طے کیے جانے تھے۔ گرما گرم بحث کے عین درمیان میں اسکندر مرزا... جو اس وقت سیکرٹری کابینہ تھا... کھڑا ہوا اور وزیرِ اعظم کی اجازت لیے بغیر کمرے سے باہر نکل کھڑا ہوا۔ وہ دس منٹ بعد کابینہ کے اجلاس میں واپس لوٹا اور تمام موجودگان کے حضور میں اعلان کیا کہ انھیں مزید خود کو تھکانے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس نے لاہور کے کور کمانڈر 'لیفٹیننٹ جنرل اعظم خان' سے بات کرلی ہے، وہ اگلی صبح وہاں مارشل لا لگانے کو تیار ہے۔ اس سے مجلس کا اختتام ہو گیا۔ نہ ہی وزیرِ اعظم اور نہ ہی کسی دوسرے کو ہمت ہوئی کہ وہ اسکندر مرزا کے استبدادی فیصلے اور توہین آمیز رویے کو چیلنج کرتا"۔

---

[12] جرنیل اور سیاستدان تاریخ کی عدالت میں، ص۴۹

[13] چونکہ یہ راوی خود سیکولر ہے اس وجہ سے اس نے یہاں فساد کا لفظ استعمال کیا ہے، وگرنہ اس سے مراد 'تحریکِ ختم نبوت' ہے جس کا ذکر ذرا آگے چل کر آرہا ہے۔

اس سے اندازہ کیجیے کہ اسکندر مرزا کے ہاتھ میں کس قدر طاقت تھی کہ ایک تو وہ آزادانہ فیصلے کرتا تھا اور کوئی دوسرا اس کے فیصلوں پر اعتراض بھی نہیں کر سکتا تھا۔

۱۹۵۳ء میں لاہور میں پاکستان کا پہلا مارشل لاء اور ختمِ نبوت سے دشمنی

چونکہ مذکورہ بالا اقتباس میں ۱۹۵۳ء کے لاہور میں مارشل لاء کا ذکر ہوا، اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ اس کے حوالے سے بھی چند جملے زیبِ قرطاس کر دیے جائیں، کیونکہ یہ کارنامہ حکومت و فوج کی اسلام دشمنی کا واضح ثبوت ہے، جس سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔

یہ وہ وقت تھا جب حکومت میں قادیانیوں کا اثر و رسوخ بڑھتا جا رہا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد سے وزیرِ خارجہ ظفر اللہ قادیانی چلا آ رہا تھا جسے حکومت ہٹانے کو تیار نہ تھی۔ اس وقت پورے ملک کے علمائے کرام نے تحریک چلانے کا فیصلہ کیا، تاکہ ملکِ پاکستان میں کم از کم قادیانیوں کو کافر قرار دیا جائے اور انھیں حکومتی عہدوں سے بے دخل کیا جائے۔ امیرِ شریعت حضرت ’عطاء اللہ شاہ بخاری‘ رحمہ اللہ اور ’مجلسِ احرارِ اسلام‘ اس تحریک میں پیش پیش تھے۔ تحریک کا مرکز لاہور تھا جہاں ہزاروں کی تعداد میں عاشقانِ مصطفیٰ ﷺ سڑکوں پر نکل آئے تھے۔ اس کے علاوہ ملتان، فیصل آباد اور جھنگ میں بھی تحریک جاری تھی۔ اس وقت اسکندر مرزا کے فیصلے کے ساتھ پاکستانی فوج نے لاہور میں مارشل لاء لگایا اور یہ مارشل لاء لگانے والا شیطان ’لیفٹیننٹ جنرل اعظم خان‘ تھا، جو کمانڈر انچیف جنرل ایوب خان کا قریبی دوست اور معتمد ساتھی تھا۔ ان دونوں کے باپ بھی رائل انڈین آرمی میں ایک ساتھ تھے اور اس وقت سے ان کے درمیان تعلقات استوار تھے۔ اس شخص کو ایوب خان نے صدر بننے کے بعد اپنی کابینہ میں بھی شامل کیا اور یہ اس وقت سے لے کر ۱۹۶۲ء میں اپنی ریٹائرمنٹ تک مشرقی پاکستان کا گورنر رہا۔ تعجب خیز بات ہے کہ ۱۹۶۴ء کے صدارتی انتخابات میں بھی جنرل ایوب کے مقابلے میں فاطمہ جناح کو اپوزیشن سامنے نہ لاتی تو ان کے پاس آپشن کے طور پر یہی انسان صورت شیطان تھا۔

لیفٹیننٹ جنرل اعظم خان کے احکامات پر فوج اور پولیس نے لاہور بھر میں تین روز تک قتلِ عام کیا اور ہزاروں کی تعداد میں عاشقانِ مصطفیٰ ﷺ کو بے دریغ شہید کیا گیا۔ سرکاری رپورٹوں میں آج تک سارا الزام ختمِ نبوت کے متوالوں کو دیا جاتا ہے، جبکہ قتل کرنے والے جرنیل اور افسران بعد میں بھی حکومت کرتے

رہے اور اس ملک میں معزز بنے رہے۔ یہ واقعہ اس فوج اور اس کے جرنیلوں کی اسلام دشمنی کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ جہاں ختمِ نبوت کا انکار کرنا کفر اور بدترین زندقہ ہے، وہاں ختمِ نبوت کے اقرار کے لیے نکلنے والے مسلمانوں کو قتل کرنا کس حکم میں آتا ہے؟ یقیناً یہ بھی کفر اور زندقہ ہے۔

گورنر جنرل غلام محمد اور اسکندر مرزا

لیاقت علی خان کے قتل کے بعد خواجہ ناظم الدین جو اس وقت گورنر جنرل تھے، وزیر اعظم بنا دیے گئے۔ گورنر جنرل کے عہدے پر ایک بیمار انسان کو بٹھا دیا گیا اور وہ بیمار آدمی ملک غلام محمد تھا۔ اس وقت پاکستان میں ’گورنر جنرل‘ کا عہدہ ’وزیرِ اعظم‘ کے عہدے سے زیادہ قوت کا حامل تھا۔

غلام محمد خود تو ایک اپاہج فالج زدہ انسان تھا جس کی تو بات بھی کسی کی سمجھ میں نہ آتی تھی، اس کی ساری کی ساری حکومت دو افراد کے بل بوتے پر تھی، اور وہ دونوں میجر جنرل اسکندر مرزا اور جنرل ایوب خان تھے۔ غلام محمد کے دور میں تو مکمل اختیار انھی دونوں حضرات کے پاس تھا اور کاروبارِ حکومت وہی چلا رہے تھے اور ان دونوں کو در حقیقت برطانیہ اور امریکہ کی پشت پناہی حاصل تھی۔

۱۶ اپریل ۱۹۵۳ء کو اسکندر مرزا اور جنرل ایوب خان ہی کی آشیر باد پر گورنر جنرل غلام محمد نے خواجہ ناظم الدین کو برطرف کر دیا۔ یہ اس ’مسلم لیگ‘ کا خاتمہ تھا جس نے پاکستان کے قیام کے لیے بنیادی کردار ادا کیا تھا۔ سردار عبد الرب نشتر کو تو پہلے ہی اسکندر مرزا نے ایک طرف کر دیا تھا، خواجہ ناظم الدین کو بھی اس نے اور جنرل ایوب نے برطرف کروا دیا۔ پاکستان بنانے والی ’مسلم لیگ‘ جو پہلے دو سالوں میں ہی اختیار کھو چکی تھی، محض چھ سالوں کے اندر سیاست سے بھی بے دخل کر دی گئی۔

خواجہ ناظم الدین نے ملکہ برطانیہ سے اپیل کی کہ غلام محمد نے اپنے اختیارات سے تجاوز کیا ہے، لیکن ملکہ کی طرف سے کوئی جواب موصول نہ ہوا۔ بھلا وہ کیسے حمایت کرتی کیونکہ برطانیہ کی مرضی انھی حضرات کے ہاتھ میں تھی۔ اس کے برعکس امریکہ میں پاکستانی سفیر ’محمد علی بوگرہ‘ کو لا کر وزیر اعظم بنا دیا گیا۔ اس تقرری کا ذکر کرتے ہوئے گورنر جنرل غلام محمد کے سیکرٹری قدرت اللہ شہاب اپنی خود نوشت میں لکھتے ہیں:

”جب ہنگامی حالات کا اعلان ہوا اور اسمبلی کی برطرفی کے بعد نئی کابینہ بنی تو ایوب خان نے کمانڈر

انچیف کے عہدے کے ساتھ ساتھ وزیرِ دفاع کا منصب بھی قبول کر لیا۔ اسکندر مرزا اس نئی کابینہ میں وزیرِ داخلہ مقرر ہوئے۔ ان دونوں حضرات کی رفاقت مسٹر غلام محمد کے لیے بڑی زبردست پشت پناہی تھی اور غالباً یہی وہ شہہ تھی جس کے زور پر انھوں نے اتنا بڑم قدم اٹھایا تھا۔ اس زمانے میں اس کابینہ کو Cabinet of Lent کہا جاتا تھا"۔[14]

چونکہ غلام محمد تو اسکندر مرزا کے ہاتھ کا کھلونا تھا، وزیر اعظم محمد علی بوگرہ نے بھی جب ان حضرات کی خواہش کے خلاف ذرا جمہوری کوششوں کا آغاز کیا تو اکتوبر ۱۹۵۴ء میں اسمبلی تحلیل کر دی گئی۔ غلام محمد کی اصل طاقت کا سرچشمہ بیان کرتے ہوئے قدرت اللہ شہاب نے بڑی وضاحت سے لکھا ہے:

"مجھ سے کئی بار سوال کیا گیا ہے کہ مسٹر غلام محمد اس قدر شدید بیمار تھے کہ وہ چل پھر نہ سکتے تھے۔ بول نہ سکتے تھے، زیادہ لکھ پڑھ نہ سکتے تھے، لیکن اس کے باوجود وہ بڑے رعب داب سے حکمرانی کرتے رہے۔ ان کی طاقت کا اصلی راز کیا تھا؟

اس سوال کے دو جواب ہیں۔ ایک جواب یہ ہے کہ مسٹر غلام محمد کی طاقت کا سرچشمہ سیاست دانوں کی کمزوری تھی۔

اس کے علاوہ دوسرا جواب یہ بھی ہے کہ جنرل اسکندر مرزا کی شہہ پر مسٹر غلام محمد کو کمانڈر انچیف ایوب خاں کی پشت پناہی بھی حاصل تھی، جو نظر نہ آنے والی روشنائی سے لکھی ہوئی تھی، مستقبل کے بارے میں ان دونوں کے اپنے اپنے عزائم تھے، جو مسٹر غلام محمد کی طرز کے گورنر جنرل کی اوٹ لیے بغیر پروان نہ چڑھ سکتے تھے"۔[15]

اسکندر مرزا بطور چوتھا اور آخری گورنر جنرل اور پہلا صدرِ مملکت

جب گورنر جنرل غلام محمد انتہائی بیمار ہو گیا تو بالآخر اسکندر مرزا نے اس سے استعفیٰ دلوایا اور اگست ۱۹۵۵ء

[14] شہاب نامہ؛ ص ۵۹۰

[15] شہاب نامہ؛ ص ۶۱۵

میں خود گورنر جنرل کی مسند پر براجمان ہو گیا۔ اس کے بعد اگلے چار سال اس نے بلاواسطہ پاکستان پر حکمرانی کی۔ ۱۹۵۶ء میں وزیرِ اعظم محمد علی چودھری کے ذریعے پاکستان کا پہلا آئین جاری کرنے کے بعد اسکندر مرزا پاکستان کا پہلا صدرِ مملکت بن گیا اور گورنر راج ختم ہو گیا۔[16] اس کے دورِ حکومت میں امریکی مشیر پورے کاروبارِ حکومت پر ٹڈی دل کی طرح چھائے رہے۔[17]

اسکندر مرزا نے اپنے دورِ گورنری اور صدارت میں فوج کی مدد کے ساتھ بڑی دھوم دھام سے پاکستان پر حکمرانی کی۔ اپنے مرضی کے وزراء لایا، نئی سیاسی پارٹیاں بنائیں اور پرانی سیاسی پارٹیوں کو دبایا۔ ری پبلکن پارٹی بنا کر پاکستان بنانے والی مسلم لیگ کی رہی سہی ساخت کا بھی مکمل خاتمہ کر دیا۔ چودھری محمد علی، حسین سہروردی، آئی آئی چندریگر اور فیروز خان نون یکے بعد دیگرے وزیرِ اعظم بنائے گئے اور پھر برطرف کیے گئے۔ یہ وزرائے اعظم ڈیکٹیشن کی بنیاد پر چلتے تھے اور ان کی اپنی کوئی مرضی نہ چلتی تھی۔ حسین سہروردی کے وزیرِ اعظم بنائے جانے کے حوالے سے مصنفہ 'عائشہ جلال' لکھتی ہے کہ جب اسے وزیر اعظم بنایا جانے لگا تو اس شرط پر بنایا گیا کہ وہ مغرب نواز خارجہ پالیسی جاری رکھے گا اور فوج کے امور میں مداخلت نہیں کرے گا۔[18]

بالآخر امریکہ بہادر کی مرضی سے اسکندر مرزا نے ایوب خان کے ساتھ مل کر مارشل لا کا اعلان کر دیا۔ لیکن اب کی مرتبہ بازی ایوب خان کے ہاتھ میں آگئی اور اس نے اسکندر مرزا کو تین ہفتوں میں صدارت سے علیحدہ کر کے لندن بھجوا دیا۔

---

[16] یہ بات بھی قارئین کی معلومات میں اضافے کے قابل ہے کہ ۱۹۵۶ء سے پہلے تک... جب تک کہ پاکستان کا اپنا آئین جاری نہیں ہوا تھا... پاکستان کی اصل حاکم ملکہ برطانیہ کہلاتی تھی جس کا نمائندہ گورنر جنرل کی شکل میں موجود ہوتا تھا۔ ۱۹۵۶ء کا آئین بننے کے بعد ملکہ برطانیہ کا راج 'کاغذوں' میں ختم ہو گیا۔

[17] یہ بات اسکندر مرزا کے سیکرٹری قدرت اللہ شہاب نے اپنی خود نوشت 'شہاب نامہ' میں لکھی ہے۔

[18] The state of Martial Rule، ص ۲۵۳

اسکندر مرزا کی اسلام و شریعت دشمنی

میجر جنرل اسکندر مرزا کے افکار کسی سے ڈھکے چھپے نہیں۔ ہمارا پورا دینی طبقہ اور علمائے کرام جانتے ہیں کہ یہ شخص کس قدر اسلام دشمن تھا۔ اسی کے طفیل ختمِ نبوت کے متوالوں کا قتلِ عام ہوا، اسی نے ملک میں سیکولرزم کی بنیاد ڈالی اور نظریہ 'وطنیت' کا کھل کر پرچار کیا۔ یہ شخص واضح طور پر اسلام کو ریاستی امور سے باہر رکھنے کا قائل تھا۔ دائرہ معارف ویکی پیڈیا میں Story of Pakistan کے حوالے سے درج ہے:

Mirza's political ideology reflected secularism, and an image of internationalism, strongly advocating the religious separation in state matters.

"مرزا کے سیاسی نظریات 'سیکولرزم' اور 'بین الاقوامیت' کے عکاس تھے، جس میں ریاستی امور سے دین کو الگ رکھنے کی بھرپور وکالت تھی"۔

اسکندر مرزا کے سیکرٹری قدرت اللہ شہاب نے بھی اپنی خود نوشت میں اس بات کا ذکر کیا ہے کہ اسکندر مرزا کو اسلام سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ وہ ۱۹۵۶ء کے آئین کے نفاذ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء کو جب ایوانِ صدر میں نیا آئین نافذ کرنے کی تقریب منعقد ہو رہی تھی تو اس دوران دو بدشگونیاں[19] ظہور میں آئیں۔ تقریب شروع ہونے سے کچھ دیر پہلے بڑے زور کی آندھی آئی اور تیز بارش ہوئی جس سے شامیانے کا کچھ حصہ چند مہمانوں کے اوپر گر گیا جن میں اسمبلی کے اسپیکر عبدالوھاب خاں بھی شامل تھے۔… دوسری بدشگونی صدر کے طور پر میجر جنرل اسکندر مرزا کا

---

[19] قارئین اس بات کو ضرور ملحوظ رکھیں کہ اسلام میں کسی چیز سے بدشگونی کا کوئی تصور موجود نہیں۔ ہمارے پیارے پیغمبر ﷺ نے واضح طور پر اس کی نفی فرمائی ہے۔ قدرت اللہ شہاب کا بدشگونی لینا ہمارا مطمح نظر نہیں، ہمارا مقصد اس کے اقتباس سے اسکندر مرزا کی اسلام سے دوری بیان کرنا ہے۔

تقرر تھا۔ نیا آئین اسلامی [20] اور جمہوری اقدار کا حامل تھا، لیکن ملک کے پہلے صدر کو ان دونوں اقدار سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ نئے آئین کو اسکندر مرزا کی صدارت میں چلانا ویسے ہی تھا جیسے دودھ کو بلی کی رکھوالی میں رکھنا"۔ [21]

اسکندر مرزا کے سیکرٹری سے زیادہ کس شخص نے اسے دورِ حکومت میں دیکھا ہو گا، اس کی گواہی دیکھیے کہ اس شخص کا اسلام سے دور کا واسطہ بھی نہ تھا۔ ایک ایسا شخص جس کا اسلام سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا، اسلام کے نام پر بننے والے 'پاکستان' کے پہلے دس سالوں میں اس ملک کا کرتا دھرتا تھا۔ بھلا اس سے توقع کی جا سکتی تھی کہ وہ یہاں اسلام اور شریعت کے نفاذ کی طرف قدم بڑھائے گا۔ اس شخص نے پاکستان میں شراب و کباب اور زن وزنا کا کلچر عام کیا اور مغربی معاشرت پھیلانے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ خود گورنر جنرل ہاؤس میں بھی یہی کلچر ہوتا تھا۔ اسکندر مرزا کے گورنر جنرل ہاؤس کی ایک جھلک خود اسی سیکرٹری کی زبانی ملاحظہ کیجیے۔ یہ اس شخص کی بدکرداری کی کھلی دلیل ہے۔ کس قدر افسوس کی بات ہے کہ پاکستان کے پہلے دس سالوں میں حکومت کس قدر رذیل لوگوں کے ہاتھ میں تھی، جن میں نہ عقائد مسلمانہ تھے اور نہ ہی کردار۔ اسلام کے نام پر کتنا بڑا مذاق تھا جو کیا جا رہا تھا۔ ہم یہاں قدرت اللہ شہاب کا اقتباس نقل کرتے ہیں لیکن اس میں سے

[20] جہاں تک قدرت اللہ شہاب کا یہ کہنا ہے کہ ۱۹۵۶ء کا آئین اسلامی اقدار کا حامل تھا، تو یہ اس کی اپنی نظر ہے۔ وگرنہ ایک چیز اسلامی اور جمہوری دونوں اقدار کی بیک وقت کیسے حامل ہو سکتی ہے، جبکہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ یہی معاملہ تو آج تک مملکتِ پاکستان میں چلا آ رہا ہے کہ اسے خالص اسلامی بنانے کی کوششیں کرنے کی بجائے اسلام اور جمہوریت، اسلام اور مغربیت، اسلام اور جدت پسندی کا ملغوبہ ہی بنایا جاتا ہے جس کے نتیجے میں اسلام تو آتا نہیں، لیکن کفر ضرور در آتا ہے۔ پھر یہ بات قابلِ التفات ہے کہ آئین جس قدر اسلامی اقدار کا حامل ہوتا ہے تو وہ آئین جن لوگوں کو زمامِ اقتدار دیتا ہے، ان کا اسلامی اقدار سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ بھلا یہ کیسا اسلامی اقدار کا حامل آئین ہے جو اسلامی اقدار سے باغی لوگوں کو حکمرانی سے نہیں روکتا۔ ایسا ہی آئین صدر ایوب خان نے بھی بنایا اور ایسا ہی آئین ۱۹۷۳ء میں بنا جو آج تک ترمیمات کے ساتھ پاکستان میں نافذ ہے! ان تینوں آئینوں میں 'اسلام' اسی قدر ہے جس قدر منافقینِ مدینہ کے دلوں میں تھا، جس قدر قرامطہ کے افکار میں تھا، جس قدر چنگیزیوں کے دستور 'یاسق' میں تھا اور جس قدر سر سید کے ملحدانہ نظریات میں تھا... وہ 'اسلام' جس کی اجازت سیکولرزم خود دیتا ہے، نہ کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے نبی آخر الزماں سیدنا محمد ﷺ پر نازل کردہ حقیقی اسلام۔

[21] شہاب نامہ، ص ۶۲۶

بھی بعض جملے حذف کر کے... کیونکہ وہ اس قدر خسیس ہیں جنھیں نقل کرنا ہمارے لیے یہاں ممکن نہیں:

''میجر جنرل اسکندر مرزا اور بیگم ناہید مرزا کے آتے ہی گورنر جنرل ہاؤس میں دعوتوں اور پارٹیوں کا دور شروع ہو گیا۔ کبھی ڈنر، کبھی ڈانس، کبھی مون لائٹ پکنک۔ وقتاً فوقتاً نئی نئی تقریبات منعقد ہوتی رہتی تھیں، جو آٹھ ساڑھے آٹھ بجے شروع ہو کر رات کے ڈیڑھ دو بجے تک چلتی تھیں۔ عورتوں کے لیے تو یہ ایک طرح کی فیشن پریڈ ہوتی تھی جس میں وہ اپنے حسن و جمال کے علاوہ قسم قسم کے ملبوسات کی نمائش کیا کرتی تھیں۔ کچھ خواتین ایسا لباس پہننے میں مہارت رکھتی تھیں جو جسم کو چھپانے کی بجائے اسے فنکاری سے عریاں کرنے میں مدد دیتا تھا۔... ساغر و مینا کی کرامات بھی اپنا رنگ جماتی تھیں۔... ان محفلوں میں جو لوگ صاحبِ اقتدار ہوتے تھے، وہ دولت مند تاجروں اور صنعتکاروں کی طرف بصد حسرت و یاس تکتے تھے۔ جن کے پاس دولت کی فراوانی تھی، انھیں اقتدار والوں پر رشک آتا تھا۔ اور جن کے پاس دولت اور اقتدار دونوں نعمتیں تھیں، ان کی دلچسپی کا واحد مرکز عورت ذات تھی۔ کثرتِ مے نوشی کے بعد کچھ لوگ کھانے پر گدھ کی طرح گرتے تھے۔ بعض لوگ غسل خانوں میں جا کر بار بار قے کرتے تھے اور تازہ دم ہو کر از سرِ نو شراب کا دور شروع کر دیتے تھے۔ لہو و لعب کے ان مشغلوں میں انسانیت سسک سسک کر دم توڑ دیتی تھی اور بہیمیت نت نئے روپ دھارتی رہتی تھی''۔[22]

میجر جنرل اسکندر مرزا یہ ضرور جانتا تھا کہ اس ملک کے عام عوام اور مسلمانوں نے اس ملک کے حصول کے لیے لا الہ الا اللہ کا نعرہ لگایا تھا اور ان کے نزدیک پاکستان اسلام کے نفاذ کے لیے بنا تھا۔ اسی لیے اس شخص نے منافقت کا لبادہ اوڑھتے ہوئے پاکستان میں اسلام کی بجائے 'پاکستانیت' اور 'وطنیت' کا سہارا لیتے ہوئے خود کو حب الوطن ظاہر کرنے کی کوشش کی اور عوام کی پاکستان محبت کے سائے میں اپنے لیے پناہ تلاش کی۔ اسکندر مرزا نے ۷ فروری ۱۹۵۵ء کو نیویورک ٹائمز کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا:

---

[22] شہاب نامہ، ص ۶۱۸

We cannot run wild on Islam, it is Pakistan first and Pakistan last.[23]

"ہم پاگلوں کی طرح اسلام کے پیچھے نہیں دوڑ سکتے، 'پاکستان' سب سے پہلے اور 'پاکستان' سب سے آخر ہے"۔

یہی وہ نظریہ ہے جسے بعد والوں نے بھی اپنایا اور اپنے اسلام و شریعت دشمن نظریات کو 'پاکستانیت' کے پردے میں چھپاتے رہے اور اسلام کو فروغ دینے کی بجائے یہاں 'پاکستانیت' کو فروغ دیتے رہے۔ آج بھی یہی کہانی دہرائی جارہی ہے۔

جنرل ایوب خان اور پاکستان میں پہلا مارشل لاء

پاکستان میں ۷ اور ۸ اکتوبر ۱۹۵۸ء کی درمیانی شب صدر اسکندر مرزا نے فیروز خان نون کی حکومت تحلیل اور ۱۹۵۶ء کا آئین معطل کرتے ہوئے مارشل لاء لگانے کا اعلان کیا اور چیف مارشل لا ایڈمنسٹیٹر جنرل ایوب خان کو بنایا اور خود بدستور صدارت پر فائز رہا۔ تاہم اسکندر مرزا اور جنرل ایوب خان کے درمیان اختیارات کی جنگ میں اسکندر مرزا ہار گیا اور جنرل ایوب خان نے... محض تین ہفتے بعد... ۲۷ اکتوبر کو اسکندر مرزا کی صدارت ختم کردی اور خود صدر بن بیٹھا۔

اسکندر مرزا اور جنرل ایوب خان کے اس سارے کھیل میں برطانیہ اور امریکہ بہادر ان کے ساتھ شامل تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دور میں امریکہ اور روس کی سرد جنگ چل رہی تھی اور امریکہ کو یہ خطرہ تھا کہ کہیں کیمونسٹ افکار پاکستان میں رائج نہ ہو جائیں اور پاکستان روس کے بلاک میں شامل نہ ہو جائے۔ اس بنیاد پر اسکندر مرزا اور جنرل ایوب خاں نے امریکہ کو یقین دہائی کرائی کہ جب پاکستان پر اقتدار فوج کے ہاتھ میں رہے گا تو یہ خطرہ باقی نہ رہے گا۔ اسی بنیاد پر امریکی آشیر باد پر ان دونوں نے پاکستان میں مارشل لا لگا دیا۔ پاکستان میں کئی کلیدی عہدوں پر فائز رہنے والے 'الطاف گوہر'... جو اس وقت وزیر اعظم ملک فیروز خان نون کے ڈپٹی

[23] جرنیل اور سیاست دان تاریخ کی عدالت میں، ص ۵۵

سیکرٹری تھے اور بعد میں جنرل ایوب خان کے سیکرٹری اطلاعات رہے... نے صحافی جاوید چودھری کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے اس حقیقت کو ان الفاظ میں آشکارا کیا:

"اسکندر مرزا نے ملک فیروز خان نون سے چھٹکارا پانے کا بھی فیصلہ کر لیا۔ وہ ۵۷ء کے آخر میں مارشل لا لگانا چاہتے تھے لیکن امریکیوں نے انھیں روک دیا تھا۔ بعد ازاں ۱۹۵۸ء میں وزیرِ خزانہ امجد علی شاہ اور جنرل ایوب خان امریکہ گئے اور امریکی انتظامیہ کو سمجھالیا کہ آپ پاکستان میں الیکشن نہ کرائیں [24]، ورنہ بھاشانی اور عبد الغفار خان جیسے کیمونسٹ بر سرِ اقتدار آجائیں گے۔ پاکستان میں صرف فوجی راج ہی تمہارے لیے سود مند ہے۔ نون کی بد قسمتی ملاحظہ کریں، خود اس کا وزیرِ خزانہ اور کمانڈر انچیف امریکہ میں حکومت کے خلاف مذاکرات کر رہے تھے اور انھیں خبر تک نہ تھی۔

ایوب خان کی مدتِ ملازمت ختم ہونے والی تھی اور انھیں توسیع کی بڑی فکر تھی۔ جوں جوں ریٹائرمنٹ کا وقت قریب آرہا تھا، ایوب خان توں توں پریشان ہوتے جا رہے تھے۔ پھر وزیر اعظم راولپنڈی کے دورے پر آئے تو وہ ایوب خان کے پاس ٹھہرے اور ایوب کو ایکسٹینشن دے دی گئی۔ جس کے فوراً بعد ایوب نے امریکیوں کے ساتھ مل کر جو منصوبہ تیار کیا تھا، اس کی زمین ہموار ہو گئی"۔ [25]

ایوب خان کا تعارف

ایوب خان کے اقتدار پر بات کرنے سے پہلے یہاں اس کی سابقہ زندگی کا ذکر اور اس کا تعارف کرانا موزوں رہے گا، تاکہ قارئین کو معلوم ہو جائے کہ یہ شخص بھی اپنے پیش رووں کی طرح برطانیہ کا خاص وفادار

[24] قارئین! ذرا یہاں الطاف گوہر کے الفاظ پر غور کیجیے کہ اس وقت کے پاکستان میں امریکہ کی مرضی کس طرح چلتی تھی۔ امریکہ سے کہا جا رہا ہے کہ پاکستان میں الیکشن نہ کرائیں۔ پھر آگے چل کر جیسا کہ الطاف گوہر نے ذکر کیا ہے، ایوب خان امریکہ سے منصوبہ لے کر آتا ہے اور اس کے مطابق اسکندر مرزا اور ایوب خان آگے عمل درآمد کرتے ہیں۔

[25] گئے دنوں کے سورج؛ جاوید چودھری، ص ۲۷

رہا اور اس کا خاندان بھی اسی قبیل سے تھا۔

ایوب خان کے بیٹے 'گوہر ایوب' نے اپنی کتاب Glimpses Into The Corridors of Power میں اپنے خاندان کے تعارف میں لکھا ہے:

My great-grandfather, Khuda Dad Khan, and grandfather, Mir Dad Khan, were once visiting Nurpur for the annual mela when they came upon a British cavalry regiment carrying out their training routine. Being fond of horses, father and son stopped to watch. Noticing the interest shown by the young Mir Dad Khan, the commanding officer encouraged him to join the cavalry.

In 1880, Mir Dad Khan joined the Hodson's Horse Regiment. He rose to the rank of Risaldar Major, the highest rank an Indian could attain in the army at that time.[26]

"ایک مرتبہ میرے پر دادا 'خداداد خان' اور میرے دادا 'میر داد خان' سالانہ میلے کے سلسلے میں نورپور گئے ہوئے تھے کہ دریں اثناء برطانوی گھڑ سوار رجمنٹ ان کے پاس سے گزری جو اپنی تربیتی معمول پر نکلی ہوئی تھی۔ گھوڑوں کے دلدادہ ہونے کی وجہ سے باپ بیٹا دیکھنے کے لیے کھڑے ہو گئے۔ جوان میر داد خان کی دلچسپی کا اندازہ کرتے ہوئے رجمنٹ کے کمانڈر نے اسے گھڑ سوار رجمنٹ میں شمولیت کی ترغیب دی۔

چنانچہ ۱۸۸۰ء میں میر داد خان نے 'ہڈسن گھڑ سوار رجمنٹ' میں شمولیت اختیار کرلی۔ وہ 'رسالدار میجر' کے عہدے تک ترقی کر گئے، جو اس وقت تک سب سے اونچا عہدہ تھا جو کوئی مقامی باشندہ

---

[26] Glimpses Into The Corridors of Power، ص۶

حاصل کر پاتا تھا"۔

معلوم ہوا کہ جنرل ایوب خان کا والد بھی فرنگیوں کا 'نمک خوار' تھا۔ چنانچہ بیٹا بھی اسی چلن پر چلا اور علی گڑھ یونیورسٹی سے ہوتا ہوا رائل ملٹری کالج 'سینڈ ہرسٹ' میں پہنچا۔ 'سینڈ ہرسٹ' میں تربیت پانے کے بعد ۲ فروری ۱۹۲۸ء کو 'سیکنڈ لیفٹیننٹ' کے طور پر رائل انڈین آرمی میں بھرتی ہوا۔ اس نے دوسری جنگِ عظیم میں برما کے محاذ پر اپنے آقا برطانیہ کا دفاع کیا اور اس کے بعد اسے ۱۹۴۷ء میں وزیرستان میں مجاہدین کی سرکوبی کے لیے تعینات کیا گیا۔

پاکستان کے قیام کے بعد یہ مشرقی پاکستان میں 'جی او سی' رہا۔ برطانیہ کی وفاداری کے سبب اسے جنوری ۱۹۵۱ء میں جنرل کے عہدے پر ترقی دے کر پاکستانی فوج کا کمانڈر انچیف بنا دیا گیا جب جنرل ڈگلس گریسی ریٹائر ہوا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ جنرل گریسی کے بعد میجر جنرل افتخار خان کو کمانڈر انچیف بنایا جانا تھا کیونکہ وہ برطانیہ کا سب سے زیادہ منظورِ نظر تھا لیکن وہ ایک حادثے میں مر گیا۔ اس کے بعد پاکستانی فوج میں فرنگیوں کا دوسرا بڑا وفادار جنرل ایوب خان تھا، سو اسے کمانڈر انچیف بنا دیا گیا۔ اس انتخاب میں اسکندر مرزا کا بھی پورا ہاتھ تھا۔

جنرل ایوب خان کی سیاست میں مداخلت

کمانڈر انچیف بننے کے بعد جنرل ایوب خان سیاسی معاملات میں اثر انداز ہونے لگا۔ وہ وزیر اعظم لیاقت علی خان کے مشیروں میں شامل ہو گیا۔ لیاقت علی خان کے قتل کے بعد جب گورنر جنرل کا عہدہ غلام محمد کے ہاتھ میں آگیا تو یہ اسکندر مرزا کے ساتھ غلام محمد کے قریب ہو گیا۔ ۱۹۵۴ء میں یہ وزیرِ اعظم محمد علی بوگرہ کی کابینہ میں وزیرِ دفاع کے طور پر شامل ہو گیا اور اسی عہدے پر اگلے چار سال فائز رہا۔ اصل بات یہ ہے کہ ۱۹۵۱ء کے بعد پاکستانی سیاست میں میجر جنرل اسکندر مرزا کے ساتھ دوسری بااثر شخصیت جنرل ایوب خان کی تھی۔ اس سارے عرصے میں جنرل ایوب خان سرکاری اور غیر سرکاری... دونوں سطحوں پر امریکہ و برطانیہ کے ساتھ رابطے میں رہا۔ قدرت اللہ شہاب نے تو لکھا ہے کہ ۱۹۵۴ء میں ایوب خان نے برطانیہ کے دورے

کے دوران ہی اپنے اقتدار میں آنے کا منصوبہ تیار کر لیا تھا جسے چار سال بعد عمل میں لانے کا اسے موقع ملا۔ اسے ایوب خان کا 'لندن پلان' بھی کہا جاتا ہے۔

اکتوبر ۱۹۵۸ء میں صدر اسکندر مرزا کے مارشل لاء لگانے کے فیصلے سے جنرل ایوب خان کو براہِ راست حکومت اپنے کنٹرول میں کرنے کا موقع ہاتھ آگیا۔ جنرل ایوب خان نے مارشل لاء لگا کر زمامِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے لی، ملک کی صدارت سنبھال لی اور فوجی افسران پر مشتمل اپنی کابینہ بنائی۔ جنرل ایوب خان نے اقتدار میں آتے ہی سیاستدانوں کی سرکوبی کے لیے ایبڈو (EBDO)[27] کا قانون جاری کیا اور بیشتر سیاستدانوں کو سیاست سے بے دخل کیا۔ صدر ایوب نے سیاسی جماعتوں اور سیاسی سرگرمیوں پر پابندی لگا دی۔ پارلیمانی نظام کو صدارتی نظام میں تبدیل کر دیا۔ سیاست دانوں کو بدنام کرنے کے لیے ساٹھ ہزار سیاستدانوں کو ایبڈو کے تحت نااہل قرار دے دیا جن میں سے تیس ہزار کا تعلق مشرقی پاکستان سے تھا۔ پریس اور پبلیکیشنز آرڈر جاری کر کے آزادی صحافت کو سلب کر لیا۔ فیڈرل نظامِ حکومت کی بجائے وحدانی نظام متعارف کرایا۔ مارشل لا کا ہتھکنڈا استعمال کر کے کرپشن اور نااہلی کے الزام میں ۱۳۰۰ سول سرونٹس کو ملازمتوں سے فارغ کر دیا۔ دفاع کے اخراجات اس قدر بڑھا دیے کہ قوم کے وسائل ان کے متحمل نہ تھے۔[28]

آخر ۱۹۶۲ء میں جنرل ایوب خان نے آئین جاری کیا، صدارتی کابینہ اور پارلیمنٹ بنائی اور 'کنٹرولڈ جمہوریت' کے فلسفے پر حکومت چلائی۔ دو سال بعد جنوری ۱۹۶۵ء میں صدارتی انتخابات کا ڈھونگ رچا کر اور اس میں فاطمہ جناح کو فوج کی مدد سے ہرا کر جنرل ایوب خان اگلے پانچ سالوں کے لیے صدر بن بیٹھا۔ ان پانچ سالوں میں ملک کے حالات دگرگوں ہو گئے۔ معاہدہ 'تاشقند' کے ذریعے جب پاکستان نے ۱۹۶۵ء کی جنگ میں قبضہ کیے ہوئے علاقے بھارت کو واپس کر دیے اور کشمیر پر سودے بازی کر لی تو مسلمانانِ پاکستان میں جنرل ایوب خان کے خلاف غم و غصہ بھر گیا۔ اسی دوران جنرل ایوب خان کی طبیعت بھی پے در پے دل کے دوروں

---

[27] Elective Bodies Disqualification Order

[28] جرنیل اور سیاست دان تاریخ کی عدالت میں؛ ص ۳۷

سے مضمحل ہو گئی تو وقت کے کمانڈر انچیف جنرل یحییٰ خان نے مارچ ۱۹۶۹ء میں امریکہ بہادر کے اشارے پر اقتدار سنبھال لیا۔ جنرل یحییٰ کے اقتدار پر بات کرنے سے پہلے جنرل ایوب خان کی اسلام دشمنی اور امریکہ غلامی پر بات کرنا بے سود نہ ہو گا۔

جنرل ایوب خان کی اسلام دشمنی

گوہر ایوب جو ۱۹۵۷ء کے آخر میں بطور کپتان اپنے والد ایوب خان کا ADC[29] بن گیا تھا۔ وہ اس دور میں اپنے والد کے نوجوان افسروں سے خطابات کرنے کے حوالے سے لکھتا ہے:

In Father's addresses to the officers (particularly in the officers' mess), he would not restrict himself strictly to military matters. He would often advise the officers on matters such as family planning and ways to better their lives.... Though he was criticized by the Ulema and religious parties for his position on various issues (such as family planning), he cared very little for their objections and thought them to be out-of-step with the modern world.[30]

"افسروں سے خطابات میں (بالخصوص آفیسرز میس کے خطابات میں) والد صرف عسکری امور پر گفتگو تک خود کو محدود نہ رکھتے تھے۔ وہ اکثر افسروں کو خاندانی منصوبہ بندی اور اپنی زندگیاں بہتر کرنے کے حوالے سے بھی نصیحت کرتے تھے... گو انھیں علماء اور دینی جماعتوں کی طرف سے کئی معاملات میں ان کے مواقف پر تنقید کا سامنا کرنا پڑتا تھا (جن میں سے ایک خاندانی منصوبہ بندی بھی تھا)، لیکن وہ بہت کم ان لوگوں کی بات پر دھیان دیتے تھے اور وہ ان (اہلِ دین) کو جدید دنیا سے

---

[29] Aide-de-camp یعنی کسی سینئر فوجی افسر یا حکومتی عہدیدار کا معاون خاص

[30] Glimpses Into The Corridors of Power، ص ۳۴

بہت پیچھے 'دقیانوس' سمجھتے تھے"۔

ایوب خان اپنے پیش رو اسکندر مرزا کی طرح اسلام دشمن اور سیکولر تھا۔ اس کے نظریات میں ریاستی معاملات میں اسلام کا کوئی عمل دخل نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے ۱۹۶۲ء میں پاکستان میں جو عائلی قوانین نافذ کیے، وہ اسلام مخالف اور شریعت سے متصادم تھے۔ اس پر علمائے کرام نے سخت تنقید کی اور ایسے حاکم کے کفر کا فتویٰ بھی دیا۔[31] اسی طرح جنرل ایوب خان نے سود پر مبنی معیشت کو فروغ دیا، حالانکہ اسلام سود کو اللہ سے جنگ قرار دیتا ہے۔

بات صرف یہاں تک نہ تھی، بلکہ جنرل ایوب خان نے اول کوشش یہ کی کہ پاکستان کے ساتھ 'اسلامی' کا سابقہ بھی نہ رہے اور بطور آرڈیننس اسے ہٹانے کا حکم دیا کیونکہ سیکولر نظریات کا حامل ہونے کی وجہ سے اس کے نزدیک اسلام کا ریاستی امور سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ لیکن بعد میں اپنے سیکرٹری کے اصرار پر اس نے منافقت کے تحت اپنا حکم واپس لے لیا۔ اندازہ کیجیے کہ جنرل ایوب خان تو اس حد تک جسارت کرنے والا تھا کہ وہ ملک جو اسلام کے نام پر بنا، دس سال بعد ہی اس کے نام سے بھی اسلام کا لاحقہ ہٹا دیا جائے۔ ویسے شاید اگر وہ ایسا کر دیتا تو ہمیں اپنے دینی طبقے اور اپنے عوام کو یہ سمجھانا آسان ہو جاتا کہ یہ جرنیل اور حکمران پاکستان کو اس کے اصل مقصد 'لا الہ الا اللہ' سے دور کرنا چاہ رہے ہیں تاآنکہ ہم اٹھ کھڑے ہوتے، ایک نئی تحریکِ آزادی شروع کرتے اور پاکستان کو از سرِ نو آزاد کرتے، لیکن جرنیلوں کی منافقت نے اس پر پردہ ڈالے رکھا۔

جنرل ایوب خان کا یہ سیکرٹری 'قدرت اللہ شہاب' تھا جو اپنی خودنوشت میں جنرل ایوب خان کے ابتدائی دنوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس نئے دور میں کام شروع کرتے ہی میرے دل میں یہ بات کھٹکی کہ مارشل لاء نافذ ہونے کے بعد اب تک جتنے سرکاری اعلانات، قوانین اور ریگولیشن جاری ہوئے ہیں، ان میں صرف حکومتِ

[31] فتاویٰ بینات میں اس وقت کے ایک استفتاء کے جواب میں مولانا عبد المجید دین پوری شہید رحمہ اللہ کا ایک فتویٰ درج ہے جس میں ایسے حاکم پر ارتداد کا حکم لگایا گیا جس نے اسلام کے خلاف عائلی قوانین نافذ کیے۔ مکمل فتویٰ وہاں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

پاکستان کا حوالہ دیا ہے، حکومت اسلامی جمہوریہ پاکستان کا کہیں ذکر نہیں آیا۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ شاید ڈرافٹنگ میں غلطی کی وجہ سے ایک آدھ بار یہ فروگذاشت ہو گئی ہو گی۔ لیکن جب ذرا تفصیل سے جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ جس تواتر سے یہ فروگذاشت دہرائی جا رہی ہے، وہ سہواً کم اور التزاماً زیادہ محسوس ہوتی ہے۔

اس پر میں نے ایک مختصر سے نوٹ میں صدر ایوب کی خدمت میں تجویز پیش کی کہ اگر وہ اجازت دیں تو وزارتِ قانون اور مارشل لاء ہیڈ کوارٹر کی توجہ اس صورتحال کی طرف دلائی جائے اور ان کو ہدایت دی جائے کہ جاری شدہ تمام اعلانات و قوانین کی تصحیح کی جائے اور آئندہ کے لیے اس غلطی کو نہ دہرایا جائے۔

صدر ایوب کا قاعدہ تھا کہ وہ فائلیں اور دوسرے کاغذات روز کے روز نپٹا کر میرے پاس واپس بھیج دیا کرتے تھے، لیکن معمول کے برعکس یہ نوٹ کئی روز تک میرے پاس واپس نہ آیا۔ ۵ نومبر کی شام کو میں اپنے دفتر میں بیٹھا دیر تک کام کر رہا تھا۔ باہر ٹیرس پر صدر ایوب اپنے چند رفیقوں کے ساتھ کسی معاملے پر گرما گرم بحث کر رہے تھے۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کے بعد جب سب لوگ چلے گئے تو صدر میرے نوٹ کا پرچہ ہاتھ میں لیے میرے کمرے میں آئے۔ وہ غیر معمولی طور پر سنجیدہ تھے۔ آتے ہی انھوں نے میرا نوٹ میرے حوالے کیا اور کہا: 'تمھیں غلط فہمی ہوئی ہے، ڈرافٹنگ میں کسی نے کوئی غلطی نہیں کی۔ بلکہ ہم نے سوچ سمجھ کر یہی طے کیا ہے کہ اسلامک ری پبلک آف پاکستان سے اسلامک کا لفظ نکال دیا جائے'۔

'یہ فیصلہ ہو چکا ہے یا ابھی کرنا ہے' میں نے پوچھا۔

صدر ایوب نے کسی قدر غصے سے مجھے گھورا اور سخت لہجے میں کہا: 'ہاں! ہاں! فیصلہ ہو گیا ہے۔ کل صبح پہلی چیز مجھے ڈرافٹ ملنا چاہیے۔ اس میں دیر نہ ہو'۔

اتنا کہہ کر وہ خدا حافظ کہے بغیر تیز تیز قدم کمرے سے باہر نکل گئے۔ اگر مجھ میں ہمت ہوتی تو میں بھی ان کے پیچھے پیچھے بھاگتا اور انھیں روک کر پوچھتا کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان سے اسلامی کا لفظ حذف

کرنے والے آپ کون ہوتے ہیں؟ لیکن اتنی ہمت مجھ میں نہ تھی، اس لیے میں بھی دم دبائے چپ چاپ گھر واپس آگیا۔ بڑے سوچ بچار کے بعد صبح کے قریب میں نے پریس ریلیز تو تیار نہ کیا بلکہ اس کی جگہ دو ڈھائی صفحوں کا ایک نوٹ لکھا، جس کا لبِ لباب یہ تھا کہ پاکستان کو اسلام سے فرار ممکن نہیں۔ اس ملک کی تاریخ پرانی لیکن جغرافیہ نیا ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ریڈکلف لائن صرف اس وجہ سے کھینچی گئی تھی کہ ہم نے یہ خطہ ارضی اسلام کے نام پر حاصل کیا تھا۔ اب اگر پاکستان سے اسلام کا نام الگ کر دیا گیا تو حدبندی کی یہ لائن معدوم ہو جائے گی...... اس لیے اسلام ہماری طبعِ نازک کو پسندِ خاطر ہو نہ ہو، اسلام ہماری طرزِ زندگی کو راس آئے یا نہ آئے، ذاتی طور پر ہم اسلام کی پابندی کرتے ہوں یا نہ کرتے ہوں، حقیقت بہر حال یہی ہے کہ اگر آخرت کے لیے نہیں تو اسی چند روزہ زندگی میں خود غرضی کے طور پر اپنے وطن کی سلامتی کے لیے ہمیں اسلام کا ڈھول اپنے گلے میں ڈال کر برسرِ عام ڈنکے کی چوٹ پر بجانا ہی پڑے گا، خواہ اس کی دھمک ہمارے حسنِ سماعت پر کتنی ہی گراں کیوں نہ گزرے۔

......میں اپنے آفس وقت سے پہلے پہنچ گیا۔ خیال تھا کہ صدر ایوب کے آنے سے پہلے اپنا نوٹ ٹائپ کروا رکھوں گا۔ لیکن وہاں دیکھا تو صدر صاحب پہلے ہی برآمدے میں ٹہل رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی کمرے میں آگئے اور پوچھا: 'ڈرافٹ تیار ہے؟'

میں نے جواب دیا کہ تیار تو ہے لیکن ابھی ٹائپ نہیں ہوا۔

'کوئی بات نہیں' انھوں نے کہا۔ 'ایسے ہی دکھاؤ'۔

وہ میرے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئے اور میرے ہاتھ کا لکھا ہوا نوٹ پڑھنے لگے۔ چند سطریں پڑھ کر کچھ چونکے اور پھر از سرِ نو شروع سے پڑھنے لگے۔ جب ختم کر چکے تو کچھ دیر خاموش رہے۔ پھر آہستہ سے بولے: Yes, Right You Are۔ پھر نوٹ ہاتھ میں لیے کمرے سے چلے گئے۔ اس کے بعد اس موضوع پر پھر کسی نے کبھی کوئی بات نہیں کی"۔

اس واقعے سے ایوب خان کے ارادوں کا علم ہوتا ہے، لیکن جب اسے اپنے سیکرٹری کی طرف سے ہی ایسے

جواب کا سامنا کرنا پڑا اور پھر سیکرٹری نے بھی یہ راہ دکھلا دی کہ اگر دل و ذہن نہیں بھی مانتا تو کم از کم منافقت کرتے ہوئے یہ سابقہ لگا رہنے دیا جائے۔ اسی بنیاد پر ایوب خان نے منافقت کے تحت اسلام کا سابقہ رہنے دیا۔

ایک اور واقعہ جو ایوب خان کی بے دینی کی مثال ہے جسے قدرت اللہ شہاب نے ذکر کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جن دنوں ایوب خان صدارت پر فائز ہوا تو اس نے آئین سازی کی طرف توجہ دینا چاہی۔ اس کے لیے آئین کمیشن کی سفارشات اسے پسند نہ آئیں۔ نتیجے میں اس نے خود یہ کام اپنے سر لینے کا فیصلہ کیا اور اس کے لیے اپنی سرکردگی میں ایک کمیٹی بنا کر نشستوں کا سلسلہ شروع کیا۔ ایک روز صدر ایوب نے حسبِ معمول اپنے سیاسی فلسفے پر ایک طولانی تقریر ختم کی تو ایک سینیئر افسر... جو مرزائی تھا... وجد کی کیفیت میں آکر جھومتے ہوئے اٹھا اور سینے پر دونوں ہاتھ رکھ کر عقیدت سے بھرائی ہوئی آواز میں بولا: ’جناب! آج تو آپ کے افکارِ عالیہ میں پیغمبری شان جھلک رہی تھی‘۔ (لاحول ولا قوۃ اِلا باللہ)

قدرت اللہ شہاب کے بقول یہ خراجِ تحسین وصول کرنے کے لیے صدر ایوب نے بڑی تواضع سے گردن جھکائی۔ قدرت اللہ شہاب کو صدر ایوب کے اس رویے سے خطرہ ہو گیا کہ کہیں واقعی ایوب خان اوپر کی طرف نہ اڑنے لگے (اور پیغمبر بننے کی نہ ٹھان لے) تو بیچ میں آکر اس نے صدر ایوب کو مخاطب کر کے اس مرزائی افسر کو ملامت کیا تو معاملہ باہم بگڑ گیا اور پھر ایوب خان نے معاملہ رفع دفع کیا۔[32]

جنرل ایوب خان اور امریکہ غلامی

جنرل ایوب خان پاکستان میں امریکہ کا خاص وفادار تھا اور اس نے اقتدار میں آنے سے پہلے اور بعد میں امریکہ سے خوب وفاداری نبھائی۔ قدرت اللہ شہاب نے لکھا ہے:

”اقتدار میں آنے سے بہت عرصہ قبل ہی ایوب خان صاحب امریکہ پرستی کے بین الاقوامی فیشن ایبل مرض میں مبتلا ہو چکے تھے۔ بری افواج کے کمانڈر انچیف کی حیثیت سے انھوں نے پاکستانی حکومت سے بالا بالا واشنگٹن میں امریکی فوجی ہیڈ کوارٹر Pentagon سے نہایت گہرے دوستانہ روابط قائم کر رکھے

[32] شہاب نامہ؛ ص ۷۶۳، ۷۶۴

تھے۔ امریکی فوجی لیڈروں کے اثر ورسوخ کے تحت اور ان کی رہنمائی میں ہمارے کمانڈر انچیف نے اپنی افواج کو اس طور پر منظم آراستہ اور مسلح کرنا شروع کیا کہ آئندہ ہمیں امریکہ کی فوجی امداد کے بغیر اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا یا متبادل دفاعی حکمتِ عملی اختیار کرنا محال ہی نہیں بلکہ ناممکن ہو گیا"۔

جنرل ایوب خان نے ستمبر اکتوبر ۱۹۵۳ء میں سول حکومت کو اعتماد میں لیے بغیر اپنی منشا کے مطابق امریکہ کا دورہ کیا، حالانکہ پاکستان کے سویلین سربراہ اور وزیرِ خارجہ امریکہ کا دورہ کرنے کا پروگرام ترتیب دے رہے تھے۔ ایوب خان نے مناسب قیمت پر ایک ایسی ڈیل کی کوشش کی جس کے مطابق پاکستان مغرب کے اتحادی کا کردار ادا کر سکے۔ امریکہ کے صدر 'آئزن ہاور' (Dwight Eisenhower) نے کوریا سے توجہ ہٹا کر پاکستان، ایران، ترکی اور عراق جیسی فرنٹ لائن ممالک کی عسکری صلاحیت بڑھانے پر توجہ دی جس کا مقصد روس کے گرد ایک مضبوط حصار قائم کرنا تھا۔ شیریں طاہر خیلی نے The United States and Pakistan میں لکھا ہے کہ امریکی تعاون حاصل کرنے کے لیے ایوب خان اس حد سے آگے چلے گئے کہ انھوں نے امریکی اہلکار کو کہا کہ:

Our army can be your army if you want.[33]

اگر آپ چاہیں تو ہماری آرمی آپ کی آرمی بن سکتی ہے۔

شرط یہ ہے کہ قیمت مناسب دی جائے[34]۔

جنرل ایوب خان اس خطے میں امریکی مفادات کا سب سے بڑا علمبردار تھا اور اس نے ہر اس قدم کی بھرپور مخالفت کی جس کے ذریعے امریکی امداد کو کم کرنے کی کوشش گئی۔ اگست ۱۹۵۸ء میں جب سٹیٹ بینک کے گورنر عبدالقادر نے حکومت کو مشورہ دیا کہ افراطِ زر کو کنٹرول کرنے کے لیے دفاعی بجٹ اور امریکی ایڈ کم کی جائے تو جنرل ایوب خان نے وزیر اعظم کو خط لکھ کر گورنر سٹیٹ بینک کے خلاف سخت الفاظ استعمال کیے اور

---

[33] The United States and Pakistan، ص ۳۔ بحوالہ جرنیل اور سیاستدان تاریخ کی عدالت میں، ص ۵۱

[34] جرنیل اور سیاستدان تاریخ کی عدالت میں، ص ۵۱

اس کی ناپسندیدہ سرگرمیوں کو روکنے کی ہدایت کی۔[35]

جنرل ایوب خان نے اپنے دورِ صدارت میں پاکستانی فوج کو عملی اور فکری طور پر امریکہ کی فوج بنادیا۔ پھر اس کے بعد امریکہ نے اپنی خواہش اور مفاد کے مطابق پاکستانی فوج سے کام لیا۔ صدر ایوب نے امریکی میل کی وجہ سے فوج کے اسٹرکچر کو تبدیل کر دیا۔...... امریکی ٹریننگ اور تکنیک کے ساتھ ساتھ امریکی نظریہ بھی فوجی تعلیم کا حصہ بنا۔[36]

دائرہ معارف Wikipedia میں ایوب خان کے دورِ حکومت کے حوالے سے درج ہے:

Ayub Khan continued his predecessors' policy of an alliance with the United States during the Cold War, joining CENTO, and allowing the U.S. and Britain access to facilities inside Pakistan, most notably the airbase outside of Peshawar, from which U-2 intelligence flights over the Soviet Union were launched.

"ایوب خان نے اپنے پیش رو کی طرح سرد جنگ میں امریکہ کے ساتھ اتحاد کی پالیسی کو جاری رکھا، سیٹو میں شمولیت اختیار کی، امریکہ اور برطانیہ کو پاکستانی اڈوں تک رسائی دی، بالخصوص پشاور سے باہر موجود ایئر بیس تک رسائی دی جہاں سے سوویت یونین کے خلاف 'یو ٹو' جاسوسی طیارے اڑان بھرتے تھے"۔

یہ بات شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ ایوب خان امریکہ کا ٹوڈی تھا۔ کمانڈر انچیف رہتے ہوئے وہ مستقل امریکہ سے رابطے میں رہا اور امریکہ کی ہدایات کے مطابق فوج کا نظم ونسق بناتا رہا، امریکہ کی مرضی سے سیاست میں دخیل رہا اور پھر امریکہ ہی کی مرضی سے حکومت کرتا رہا۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ اپنے اور

---

[35] Pakistan's first Military Ruler، الطاف گوہر، ص ۱۴۴۔ بحوالہ جرنیل اور سیاستدان تاریخ کی عدالت میں، ص ۵۸

[36] سٹیفن کوہن کی The Idea of Pakistan، ص ۱۰۲۔ بحوالہ جرنیل اور سیاستدان تاریخ کی عدالت میں، ص ۶۷

پرائے سب نے اس کا عتراف کیا۔ گو اس نے منافقت اپناتے ہوئے اپنی کتاب کا عنوان ' Friends, not Masters' ایسا منتخب کیا جس سے وہ یہ احساس دلا سکے کہ وہ امریکہ کو اپنا دوست رکھنا چاہتا تھا، اپنا آقا نہیں بنانا چاہتا تھا، اور اس نے اپنی کتاب میں ایسے تمام معاملات کا کوئی ذکر نہیں کیا جس میں امریکی حکمرانوں، عہدیداران اور سفیروں سے تعلقات ظاہر ہوتے ہوں۔ لیکن اس کی یہ حقیقت اس کے پرسنل سیکرٹری قدرت اللہ شہاب، سیکرٹری اطلاعات الطاف گوہر اور دوسرے مصنفین نے کھلے لفظوں میں بیان کی ہے۔

اور یہ بات بھی شک وشبہ سے بالا ہے کہ ایوب خان ایک مثال ہے جس کی جھلک ہمیں اس کے بعد پاکستانی فوج کے ہر سربراہ میں نظر آتی رہی ہے اور آتی رہے گی۔ اس حقیقت سے چشم پوشی خود فریبی کے سوا کچھ نہیں۔

جنرل آغا یحییٰ خان کا اقتدار

جب ایوب خان نے اپنی عمر پوری کرلی اور امریکیوں نے اس سے اپنے مفادات حاصل کر لیے تو اب امریکیوں نے چاہا کہ اس کی جگہ اس کا جانشین یحییٰ خان اقتدار سنبھال لے۔ چنانچہ ایوب خان کے آخری دور میں جنرل یحییٰ نے سیاسی حالات کی خرابی میں بھرپور کردار ادا کیا اور بالخصوص مشرقی پاکستان میں سیاسی حالات کو اپنی سازشوں سے مزید پیچیدہ بنادیا، جس میں ایوب خان کے لیے اقتدار یحییٰ خان کے حوالے کرکے خود اقتدار سے علیحدہ ہونے کے علاوہ کوئی آپشن نہ تھا۔ الطاف گوہر... جو ایوب خان کے دور میں سیکرٹری اطلاعات تھے... بیان کرتے ہیں:

"امریکیوں کے لیے بھی ایوب خان کو بے دخل کرنے کا یہ بہترین موقع تھا۔ انھوں نے یحییٰ خان کا حوصلہ بڑھایا۔ یحییٰ خان نے پاورز اپنے اختیار میں لینے شروع کر دیے۔ وزراء نے بھی فوج کی طرف رخ کرلیا۔ اس وقت یحییٰ خان نے آخری ضرب لگانے کے لیے عوامی ایجی ٹیشن کی حوصلہ افزائی کا

فیصلہ کیا"۔[37]

جب صدر ایوب نے مارچ ۱۹۶۶ء میں جنرل یحییٰ کو آرمی چیف بنادیا تھا تو اب وہ صدر سے زیادہ بااختیار تھا اور بالآخر اسی اختیار کی بنیاد پر اس نے صدر ایوب کو اقتدار سے علیحدہ کر دیا۔ الطاف گوہر آخری عرصے کے حوالے سے کہتے ہیں:

"ایک روز کراچی، ڈھاکہ اور لاہور میں جزوی مارشل لاء کا فیصلہ ہوا۔ ایوب خان نے یحییٰ کو کابینہ میں بلایا تو اس نے جزوی مارشل لاء سے صاف انکار کر دیا اور صورتحال وہی ہو گئی جو کبھی اسکندر مرزا کی ایوب خان کے سامنے تھی۔ بے شک تاریخ خود کو دہراتی ہے۔

پھر یحییٰ نے ایوب سے کہا: اپوزیشن بر سرِ اقتدار آکر آپ کا ٹرائل کرنے کا منصوبہ بنا رہی ہے۔ اگر آپ مجھے موقع دیں تو میں ان سب کو سیدھا کر دوں گا۔ بھٹو کیا، مجیب کیا، سب کی چھٹی کرادوں گا۔ ایوب خان باتوں میں آ گئے۔ یحییٰ خان نے انھیں مشورہ دیا: آپ تین ماہ کے لیے چھٹی چلے جائیں اور مجھے ایک خط لکھ دیں کہ کمانڈر انچیف اپنی آئینی ذمہ داریاں پوری کریں۔ ایوب خان نے مجھے طلب کیا اور خط ڈرافٹ کرنے کا حکم دیا۔ میں خط دینے ان کے دفتر گیا تو انھوں نے مجھے کہا: تم یہ نہ سمجھنا میں ہٹ رہا ہوں۔ میں نے یحییٰ کو ہدایات دے دی ہیں اور ساتھ ہی فائل کھول کر وہ ہدایات پڑھنا شروع کر دیں جو انھوں نے بحیثیتِ صدر کمانڈر انچیف کو دیں۔ اسی اثناء میں اے ڈی سی اندر آیا اور یحییٰ خان کی آمد کی اطلاع دی۔ ایوب خان نے مجھے باہر بھیج دیا۔ بعد ازاں یحییٰ خان نے خط کا ڈرافٹ دیکھا اور اس کی منظوری دے دی۔ ایوب خان کے گمان میں ہی نہیں تھا کہ یحییٰ خان خط ملتے ہی شام کو مارشل لا لگا کر آئین ختم کر دے گا اور ساری پاورز اپنے قبضے میں لے لے گا۔ ایوب خان مارشل لاء کے بعد صرف دو دن ایوانِ صدر میں رہے"۔[38]

---

[37] گئے دنوں کے سورج؛ ص ۴۴

[38] گئے دنوں کے سورج؛ ص ۴۵

یہ بات اس قدر واضح ہے کہ الطاف گوہر کے علاوہ ایوب خان کے بیٹے گوہر ایوب نے بھی اپنی کتاب میں جنرل یحییٰ کے اس کردار کو ذکر کیا ہے۔ گوہر ایوب نے لکھا ہے کہ صدر ایوب خاں دل کا دورہ پڑنے سے شدید بیمار ہوا تو اس نے چاہا کہ قائم مقام صدر کے طور پر سپیکر قومی اسمبلی تعینات ہو، جو اس وقت گوہر ایوب تھا۔ جب گوہر ایوب نے یہ بات جی ایچ کیو میں جنرل یحییٰ کو بتائی تو اس نے سختی سے رد کر دیا اور ایسا نہ ہونے دیا، بلکہ جنرل یحییٰ کے کہنے پر صدر کی ہلکی علالت کا بہانہ بنایا گیا اور کاروبارِ حکومت بغیر اعلان کیے جنرل یحییٰ کی مرضی سے چلتا رہا۔ جب ایوب خان کو یکے بعد دیگرے مزید دل کے دورے پڑے اور وہ سرکاری امور کے قابل ہی نہ رہا تو جنرل یحییٰ نے کھل کر معاملات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ اس موقع پر گوہر ایوب نے لکھا ہے:

As it became apparent that Father's days were numbered, General Yahya Khan began to shuffle the generals around. Officers close to him were put in important positions.... So apparent was his desire to assume power that while on tour in Hong Kong, General Yahya attended a dinner where he was asked who would be president after Ayub Khan. Without batting an eye-lid, he said: 'The future president is standing before you'.[39]

"جب یہ عیاں ہو گیا کہ والد کے دن گنے جا چکے ہیں، جنرل یحییٰ خان نے اپنے گرد جرنیلوں کو آگے پیچھے کرنا شروع کر دیا۔ اس کے قریبی افسروں کو اہم عہدے دے دیے گئے۔... اقتدار پر قبضہ کرنے کی اس کی خواہش اس قدر عیاں تھی، کہ ہانگ کانگ کے دورے کے دوران جب جنرل یحییٰ خان سے ایک عشائیے میں کسی نے سوال کہ ایوب خان کے بعد ملک کا اگلا صدر کون ہو گا؟ تو پلک جھپکے بغیر جنرل یحییٰ خان نے جواب دیا: مستقبل کا صدر آپ کے سامنے کھڑا ہے!"۔

---

[39] Glimpses Into The Corridors of Power، ص ۱۱۳

آگے چل کر گوہر ایوب نے اپنے والد کی وہ بات ذکر کر دی ہے جو ہمارے اس سارے موضوع کے لیے بڑی واضح دلیل ہے کہ یہ ملک دراصل فوجی جرنیلوں کے قبضے میں ہے، وہ جیسا چاہتے ہیں، کرتے ہیں۔ گوہر ایوب لکھتا ہے کہ ستمبر ۱۹۶۸ء میں ڈی آئی جی کراچی 'اے این ترین' نے اس سے ملاقات کی اور بتایا کہ وہ مستقل جنرل یحییٰ کے کراچی کے دوروں میں اس کی متابعت کر رہا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ عسکری انقلاب یعنی coup کے لیے میدان ہموار کیا جا چکا ہے۔ اے این ترین نے خواہش ظاہر کی کہ وہ ایوب خان سے ملنا چاہتا ہے۔ گوہر ایوب نے اس کی ایوب خان سے ملاقات رکھ دی۔ ملاقات کے بعد جب گوہر ایوب نے ایوب خان سے کہا کہ اگر اس پولیس افسر کی باتوں میں سچائی ہے تو جنرل یحییٰ کی حرکتوں پر خصوصی دھیان رکھنا چاہیے۔ اس کے جواب میں ایوب خان نے تائید تو کی، لیکن:

> But then he said: 'You have served in GHQ and should know that if the Commander-in-chief of the Pakistan Army gets it into his head to take over, then it is only God above who can stop him'.[40]
>
> "لیکن پھر اس نے کہا: تم نے تو جی ایچ کیو میں نوکری کی ہے، تمہیں جاننا چاہیے کہ جب پاکستان آرمی کا کمانڈر انچیف اپنے دماغ میں اقتدار پر قبضے کا فیصلہ کر لے تو اوپر اللہ کے سوا کوئی دوسرا نہیں جو اسے اس کام سے روک سکے"۔

یہ تمام کا تمام کھیل امریکیوں کی اگر ڈِکٹیشن نہ کہیں تو امریکیوں کی ایماء پر ضرور کیا جا رہا تھا۔ اس کی گواہی جیسا کہ اوپر الطاف گوہر نے دی ہے، قدرت اللہ شہاب نے بھی دی ہے۔ اس نے ذکر کیا ہے کہ ان دنوں پاکستان میں امریکہ کی طرف سے سفیر کے طور پر مسٹر اوہلرٹ (B.H Oelhert Jr.) تعینات تھا۔ جن آخری دنوں میں ایوب خان بیماری کے سبب جنرل یحییٰ کی تحویل میں تھا، اس وقت جنرل یحییٰ سے یہی اوہلرٹ رابطے میں تھا اور جنرل یحییٰ کے مارشل لاء لگانے سے چھ دن قبل انیس مارچ کو ہنگامی طور پر مسٹر اوہلرٹ امریکہ

---

[40] Glimpses Into The Corridors of Power، ص ۱۱۴

کے لیے روانہ ہو گیا، تاکہ جنرل یحییٰ کے مارشل لاء پر مہرِ تصدیق ثبت کروائے[41]۔

آغا یحییٰ خان کا تعارف

جنرل یحییٰ کی تو اپنی زندگی برطانیہ و امریکہ غلامی کی منہ بولتی تصویر تھی۔ وہ اپنی پوری فوجی نوکری میں امریکیوں اور برطانویوں کا چہیتا تھا۔ جنرل یحییٰ بھی ایوب خان کی طرح 'رائل انڈین آرمی' کا افسر تھا جس نے قیامِ پاکستان سے قبل دوسری جنگِ عظیم میں برطانیہ کے لیے دادِ شجاعت دی اور اس پوری جنگ میں تین محاذوں (عراق، اٹلی اور شمالی افریقہ) پر لڑا۔ وہ اس جنگ کے دوران جون ۱۹۴۲ء میں شمالی افریقہ میں گرفتار بھی ہوا اور بعد میں اٹلی کے قیدیوں کے کیمپ سے بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔ اپنے کردار اور امریکہ و برطانیہ کی غلامی کے سبب محض ۳۴ سال کی عمر میں بریگیڈیر کے عہدے پر اسے ترقی دی گئی۔ دائرہ معارف ویکی پیڈیا میں اس حوالے سے یہ جملہ درج ہے:

At the age of 34, he was promoted to Brigadier due to extensive bending over for the British and Americans.

"محض ۳۴ سال کی عمر میں، اسے ... برطانیوں اور امریکیوں کے در پر مستقل سجدہ ریز رہنے کے سبب... بریگیڈیر کے عہدے پر ترقی دی گئی"۔

اس جملے سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جنرل یحییٰ اپنی نوکری کے دوران کس قدر غلامانہ کردار کا حامل تھا اور اسی کردار کے سبب امریکیوں کے دباؤ اور فرمائش پر ایوب خان نے جنرل یحییٰ کو اپنے دور میں ترقیاں بھی دیں اور بالآخر مارچ ۱۹۶۶ء میں 'کمانڈر انچیف' مقرر کر دیا۔ امریکہ غلامی کے علاوہ دوسری بڑی خاصیت جنرل یحییٰ کے کردار میں یہ تھی کہ وہ پوری دنیا میں اس وقت بھی 'شرابی' اور 'زانی' کے طور پر معروف و مشہور تھا۔ اسے hard drinking soldier کہا جاتا تھا۔ اپنے افکار میں بھی وہ انتہا درجے کا بے دین تھا جسے اسلام سے کوئی غرض نہیں تھی۔ اسی نے ایوب خان کے دورِ صدارت میں پاکستانی فوج کو امریکیوں کے مطابق ڈھالنے

---

[41] شہاب نامہ؛ ص ۸۲۷

میں بنیادی ساتھ دیا۔

جنرل یحییٰ کا دورِ حکومت

جنرل یحییٰ نے حکومت کا کنٹرول سنبھالتے ہی مارشل لاء لگایا، اسمبلی اور وفاقی کابینہ تحلیل کر دی اور سارا نظامِ حکومت چار سربراہانِ افواج میں گردش کرنے لگا:

1. جنرل یحییٰ خان

(صدرِ مملکت، چیف مارشل لاء ایڈمنسٹیٹر، اطلاعات، قانون، خارجہ اور دفاع کی وزارتیں)

2. لیفٹیننٹ جنرل عبد الحمید خان

(نائب چیف مارشل لاء ایڈمنسٹیٹر، داخلہ اور امورِ کشمیر کی وزارتیں)

3. وائس ایڈمرل سید محمد احسن

(نائب چیف مارشل لاء ایڈمنسٹیٹر، خزانہ، منصوبہ بندی کمیشن، کامرس، صنعت کی وزارتیں)

4. ایئر مارشل نور خان

(نائب چیف مارشل لاء ایڈمنسٹیٹر، مواصلات، صحت، سائنس و ٹیکنالوجی کی وزارتیں)

مکمل جرنیلی نظام تھا جس میں تمام حکومتی امور کو خالص فوجی انداز میں چلایا جاتا رہا اور حکومتی فیصلوں کے خلاف عدالتوں میں اپیل سننے پر پابندی عائد رہی۔ جب ۱۹۷۰ء میں عام انتخابات کرائے گئے تو اس کے نتیجے میں بھی مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے مابین خلیج کو دو بھر کر دیا اور جب صورتحال جنرل یحییٰ کے ہاتھ سے نکلنے لگی تو اس نے مشرقی پاکستان میں فوجی اقدام کا فیصلہ کیا۔

جنرل یحییٰ اور بنگالی مسلمانوں کا قتلِ عام

جنرل یحییٰ نے مشرقی پاکستان میں حکومتی رِٹ قائم کرنے کے لیے مارچ ۱۹۷۱ء میں آپریشن 'سرچ لائٹ' (Operation Searchlight) کے نام سے فوجی مہم شروع کی جس میں قریباً ۳ لاکھ کے قریب بنگالی مسلمانوں کو قتل کیا گیا اور ہزاروں بنگالی بہنوں کے ساتھ زبردستی زنا کیا گیا۔ آج تک پاکستانی جرنیلوں کا یہی

اسلوب ہے کہ حکومتی رٹ قائم کرنے کے لیے عوام کے خون کی ہولی کھیلی جائے۔ فوج کے اس رویے کے نتیجے میں بھارت نے مظلوم بنگالیوں کی حمایت کی اور دیکھتے ہی دیکھتے بنگالیوں نے پاکستانی فوج کے خلاف کارروائیوں کا آغاز کر دیا اور پھر بھارت خود بھی جنگ میں کود پڑا۔ نو ماہ کے اندر ہی ...دسمبر ۱۹۷۱ء... میں پاکستانی فوج نے نوے ہزار فوجیوں کے ساتھ بھارتی فوج کے سامنے ہتھیار ڈال کر بدترین شکست کو قبول کر لیا اور پاکستان دولخت ہو گیا۔

بنگالی مسلمانوں پر ظلم کی یہ داستان اتنی بھیانک ہے کہ اس کے بارے میں لکھتے ہوئے بھی قلم کانپتا ہے۔ کس طرح نہتے بنگالی مسلمانوں کو اسلحہ پوش وردی والوں نے گولیاں ماریں اور کس طرح بنگالی بہنوں کی عصمتیں پامال کیں۔ سرکاری سطح کی ’حمود الرحمٰن کمیشن رپورٹ‘ اس تاریخ کی گواہی کے لیے کافی ہے، گو اس میں بیان کردہ اعداد و شمار اصل حقیقت کے مقابلے میں بہت کم ہیں۔

یہ جنرل یحییٰ کا کارنامہ تھا۔ یہ سب کارنامہ اسی بنیاد پر ہوا کہ فوجی جرنیل خود کو اس مملکتِ پاکستان کے سیاہ و سپید کے مالک سمجھتے ہیں، جو چاہیں کریں کوئی پوچھنے والا نہیں۔ جب جنرل یحییٰ نے دیکھا کہ ملک کا یہ حال ہو گیا ہے تو اس نے فوراً اقتدار ذوالفقار علی بھٹو کے حوالے کیا اور خود کرسی صدارت سے اتر آیا۔ بھٹو نے اسے نظر بند کر دیا اور وہ جنرل ضیاء الحق کے اقتدار میں آنے تک نظر بندی کی زندگی گزارتا رہا۔ لیکن وہ جنرل ضیاء الحق جس نے صرف ’ایک‘ قتل[42] کی بنیاد پر بھٹو کو پھانسی لٹکا دیا، لاکھوں مسلمانوں کے قتلِ عام کے باوجود... پاکستانی فوج کا حقِ نمک ادا کرتے ہوئے... جنرل یحییٰ کو باعزت بری کر دیا۔

---

[42] ذوالفقار علی بھٹو کو احمد رضا خان قصوری کے والد نواب محمد احمد قصوری کے قتل کے الزام میں پھانسی دی گئی جو بھٹو دور کے دوران ۱۹۷۴ء میں قتل ہوا تھا۔ اس جملے کا مقصد بھٹو سے ہمدردی کرنا نہیں، کیونکہ اس کے جرائم بھی کم نہیں، بلکہ یہ نکتہ واضح کرنا ہے کہ فوجی جرنیل اپنے جرنیلوں کو ہر حال میں تحفظ فراہم کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے جرائم کے لیے ڈھال بنتے ہیں۔ آج بھی جنرل پرویز مشرف کو اسی فوج نے تحفظ فراہم کیا ہوا ہے۔

ذوالفقار علی بھٹو اور کمانڈر انچیف جنرل گل حسن

پاکستان دولخت کرنے کے بعد جب صورتحال فوج کے کنٹرول سے باہر ہو گئی تو فوراً جنرل یحییٰ خان نے اقتدار ذوالفقار علی بھٹو کے حوالے کر دیا۔ بھٹو پاکستان کا پہلا سویلین مارشل لاء ایڈمنسٹیٹر بن گیا۔ بھٹو جو 'اسکندر مرزا' کی بیگم 'ناہید' کے واسطے سے پاکستانی سیاست میں داخل ہوا، فوج کے سہارے ہی سیاست کا حصہ بنا رہا، بالخصوص جنرل ایوب خان نے اسے اپنی کابینہ کا حصہ بنایا اور وہ اس کے دور میں وزیرِ خارجہ کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ اس دور کے بنیادی واقعات میں بھٹو بھی پیش پیش رہا اور مشرقی پاکستان کے الگ ہونے میں بھی بھٹو کا کردار بنیادی ہے۔ پاکستان کے حق میں اتنی بڑی خیانت کرنے کے باوجود اسی شخص کو دسمبر ۱۹۷۱ء میں ملک کا سربراہ بنا دیا گیا۔

بھٹو کو سربراہ بنانے میں بھی بنیادی کردار جرنیلوں کا ہی تھا۔ جنرل یحییٰ کے ساتھ فوج کا دوسرا سینئر افسر لیفٹیننٹ جنرل عبد الحمید خان تھا جو نائب مارشل لاء ایڈمنسٹیٹر بھی تھا۔ ان دونوں کو مشرقی پاکستان کے ٹوٹنے پر... عوام اور خود فوجی جوانوں کی نفرت کے سبب... حکومت اور فوج سے علیحدہ ہونا پڑا۔ اس کے بعد سینئر ترین افسر لیفٹیننٹ جنرل گل حسن تھا جو جنرل یحییٰ کے بعد پاکستانی فوج کا کمانڈر انچیف بنا[43]۔ جنرل گل حسن ہی کے اختیار سے اقتدار بھٹو کو منتقل ہوا اور اس کے پیشِ نظر یہی تھا کہ ۱۹۷۱ء میں پاکستانی فوج کی شکست کے بعد چونکہ ملک میں فوج کا وقار بری طرح مجروح ہوا ہے اور فوجی جوانوں اور عوام میں جرنیلوں کے خلاف شدید نفرت پھیل گئی ہے، اس صورتحال میں فوج کے لیے مزید اقتدار پر قابض رہنا ممکن نہیں رہا۔ اس بنیاد پر جنرل گل حسن نے طے کیا کہ کچھ عرصہ کے لیے حکومت بھٹو کے حوالے کر دی جائے اور مناسب وقت دیکھتے ہوئے دوبارہ اقتدار فوج اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے مارشل لاء لگا دے۔ بریگیڈیر اے آر صدیقی جو اس وقت فوج کے ادارے 'آئی ایس پی آر' کا سربراہ تھا، نے اپنی کتاب East Pakistan: The End Game میں یہاں

[43] یہ شخص پاکستانی فوج کا آخری 'کمانڈر انچیف' تھا۔ اس کے بعد بھٹو دور میں یہ عہدہ 'چیف آف آرمی اسٹاف' (Chief of Army Staff) کی شکل میں ڈھل گیا۔

تک لکھا ہے کہ جنرل گل حسن نے ایئر مارشل رحیم خان سے کہا:

I am afraid we are left with no choice but to try this joker Bhutto after all he is now the leader of majority party.[44]

"مجھے ڈر ہے کہ ہمارے پاس اس 'مسخرے' بھٹو کو موقع دینے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں، آخر وہ اکثریتی پارٹی کا لیڈر رہے"۔

اس جملے سے اندازہ کیجیے کہ بھٹو کو حکومت حوالگی کا فیصلہ فوج کا سربراہ کر رہا ہے۔ اور پھر یہی فوج بھٹو کی مستقل نگرانی بھی کرتی رہی۔ خود بھٹو کے بقول جنرل گل حسن اور ایئر مارشل رحیم خان نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ دو سال انتظار کریں گے اور اس کے بعد دوبارہ اقتدار پر فوج کا قبضہ ہو جائے گا، لیکن ابتدائی حالات دیکھتے ہوئے جنرل گل حسن چھ ماہ سے زیادہ انتظار نہیں کرنا چاہتا تھا[45]۔ بس اب کی مرتبہ بھٹو نے اقدام کرتے ہوئے جنرل گل حسن اور ایئر مارشل رحیم خان... دونوں کو عہدوں سے ہٹا دیا اور جنرل گل حسن کی جگہ اپنے افکار والا 'جنرل ٹِکّا خان' کو فوج کا نیا سربراہ نامزد کر دیا۔ یہ فوج کا واحد سربراہ ہے جس نے لیفٹ ونگ کے افکار اپنائے، بھٹو کی کابینہ میں شامل ہوا اور ریٹائرمنٹ کے بعد بھٹو کی 'پاکستان پیپلز پارٹی' میں باقاعدہ رکنیت اختیار کی۔ چنانچہ اس کے ہوتے ہوئے بھٹو نے پانچ سال حکومت کی۔

یہ وہ وقت تھا جب امریکہ کی مدد سے فوج کے خفیہ ادارے 'آئی ایس آئی' کو مضبوط کیا گیا۔ اس وقت آئی ایس آئی کا سربراہ لیفٹیننٹ جنرل غلام جیلانی خان تھا۔ یہ شخص امریکہ کا خادمِ خاص تھا۔ جنرل ٹکا خان سے مایوسی کے بعد امریکہ نے اسی جنرل غلام جیلانی خان کے ذریعے پاکستان پر اپنی بالادستی قائم رکھی۔ بھٹو کے آخری دور میں بہت سے ملکی معاملات اسی جنرل کے زیرِ اثر تھے اور اسی کے دباؤ پر بھٹو نے جنرل ٹکا خان کے بعد مارچ

---

[44] جرنیل اور سیاستدان؛ تاریخ کی عدالت میں، ص ۱۰۲

[45] The Military and Politics in Pakistan، ڈاکٹر حسن عسکری رضوی، ص ۱۹۶، بحوالہ جرنیل اور سیاستدان، ص ۱۰۷

۱۹۷۶ء میں ’جنرل ضیاء الحق‘ کو فوج کا سربراہ بنا دیا، حالانکہ جنرل ٹکا خان اس فیصلے کے خلاف تھا[46]۔ پھر اسی جنرل غلام جیلانی خان کی مدد سے جنرل ضیاء الحق نے ایک سال بعد جولائی ۱۹۷۷ء میں مارشل لاء لگا کر حکومت کی زمام اپنے ہاتھ میں لے لی اور بھٹو اور جنرل ٹکا خان... دونوں کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا[47]۔

جنرل ضیاء الحق کا اقتدار

جنرل ضیاء الحق نے جولائی ۱۹۷۷ء میں اقتدار سنبھالتے ہی پاکستان میں ہر طرح کا سیاسی عمل ختم کر دیا۔ ذوالفقار علی بھٹو پر مقدمہ چلا کر دو سالوں میں اسے پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ لیکن اب کی مرتبہ جنرل ضیاء الحق نے نیا پینترا بدلا۔

یہ وہ وقت تھا جب ملک کی سابقہ تیس سالہ کارکردگی دیکھتے ہوئے پاکستان کے دینی طبقے میں سخت احتجاج موجود تھا۔ وہ دینی طبقہ جس نے قیامِ پاکستان کے لیے قربانیاں دی تھیں، ان کی قربانیاں ثمر آور ثابت نہ ہوئیں بلکہ پاکستان کے تیس سالوں میں اسے اسلام سے دور، بے دینی کی راہ پر لگا دیا گیا تھا۔ چنانچہ جنرل ضیاء الحق نے فوجی اقتدار کے ساتھ اسے اسلامی رنگ دینے کی کوشش کی، تاکہ سیاستدانوں کی مخالفت کے باوجود دینی طبقے کو... دھوکہ دہی سے... ساتھ ملا لیا جائے اور ان کے بل بوتے پر جرنیلی اقتدار کو قائم رکھا جائے۔

حقیقت میں جنرل ضیاء الحق اپنے پیش رووں سے کسی طور مختلف نہ تھا۔ اگر کچھ مختلف تھا تو اس پہلو سے کہ یہ منافقت میں بہت آگے تھا۔ جنرل ضیاء الحق نے جولائی ۱۹۷۷ء سے لے کر اگست ۱۹۸۸ء تک پورے گیارہ سال پاکستان پر حکمرانی کی۔ فضل الٰہی کے بعد ستمبر ۱۹۷۸ء میں جنرل ضیاء الحق پاکستان کا صدر بھی بن گیا۔ اس عرصے میں جنرل ضیاء الحق نے تین عہدے اپنے پاس رکھے:

1. صدرِ مملکت
2. چیف آف آرمی سٹاف

[46] یہ بات خود بھٹو نے اپنی آخری کتاب If I am Assassinated (اگر مجھے قتل کیا گیا) میں ذکر کی ہے۔

[47] بھٹو کو پھانسی کی سزا سنائی گئی اور جنرل ٹکا خان کو رہا کر دیا گیا۔

3. مارشل لا ایڈمنسٹیٹر

جنرل ضیاء الحق نے اپنی حکومت میں بیشتر عہدے فوجی جرنیلوں ہی کو دیے اور جرنیلی انداز میں حکومت چلتی رہی، سیاستدانوں کی تو ملک میں کوئی حیثیت نہ تھی بلکہ وہ سیاستدانوں کو گدھا کہا کرتا تھا[48]۔ اس کی حکومت کے بنیادی ستوں میں لیفٹیننٹ جنرل یعقوب خان تھا جو اس سے قبل یحییٰ کے دور میں مشرقی پاکستان میں بطور گورنر تعینات رہ چکا تھا اور عقیدے کے لحاظ سے اسماعیلی تھا، دوسرا نام لیفٹیننٹ جنرل کے ایم عارف کا تھا جو ضیاء کا نائب تھا، یہ بھی یحییٰ کے دور میں مشرقی پاکستان میں مذکورہ بالا جنرل یعقوب خان کے ہمراہ حکومتی خدمات انجام دے چکا تھا۔ ان دونوں کی رفاقت نے ضیاء کی حکومت کو کندھا دیا۔

اپنی مرضی کے لوگوں کو اپنا مشیر بنانے کے لیے ضیاء الحق نے پارلیمنٹ کی جگہ 'مجلسِ شوریٰ' کے نام سے مقننہ بنائی۔ اس کا ایک مقصد اپنے اقدامات کو اسلامی رنگ دینا بھی تھا۔ 'نواز شریف' اسی ضیائی دور کی پیداوار ہے جب وہ اس کی مجلسِ شوریٰ میں شامل ہوا تھا۔ بعد ازاں فروری ۱۹۸۵ء میں انتخابات کا ڈھونگ رچا کر اپنی مرضی کا وزیرِ اعظم مقرر کیا؛ 'محمد خان جونیجو' اور مارشل لاء اٹھا لیا۔ البتہ تمام اختیارات صدر کے پاس ہی رہے۔ تین سال جونیجو نے ضیاء کے سائے میں حکومت کی جس میں اس نے کئی کچھ جمہوری اقدامات کی بھی کوشش کی، لیکن جب ضیاء کے ساتھ جونیجو حکومت کی کشیدگی بڑھنے لگی تو ۱۹۸۸ء میں ضیاء نے جونیجو کی حکومت کو بھی برطرف کر دیا۔

ضیاء الحق کا تعارف

ضیاء الحق کا والد رائل انڈین آرمی سے وابستہ سٹاف کلرک تھا۔ ضیاء الحق کو مئی ۱۹۴۳ء میں رائل انڈین آرمی میں کمیشن ملا اور اس نے دوسری جنگِ عظیم میں برما کے محاذ پر جاپانیوں کے خلاف اپنے آقا 'برطانیہ' کا دفاع کیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد یہ پاکستانی فوج میں شامل ہو گیا۔ ۱۹۶۲ء سے ۱۹۶۴ء تک تین سال اس نے امریکہ میں 'امریکی فوج کے اسٹاف کالج کینساس' (US Army Command and General Staff

[48] Glimpses Into The Corridors of Power، ص ۱۸۸

(College Fort Leavenworth, Kansas) میں فوجی تربیت حاصل کی تاکہ نئے آقا امریکہ کی غلامی کا ڈھنگ سیکھ لے۔ پھر اس غلامی کا عملی ثبوت دینے کے لیے ۱۹۶۷ء سے لے کر ۱۹۷۰ء تک ضیاء الحق بطور بریگیڈیر اردن میں تعینات رہا جہاں اس نے اسرائیل کے دفاع میں فلسطینیوں کے قتل سے اپنے ہاتھ رنگے۔

سیاہ ستمبر (Black September)، فلسطینیوں کا قتل اور ضیاء الحق

مئی ۱۹۴۸ء میں اسرائیل کے قیام کے اعلان کے ساتھ بہت سے فلسطینی مسلمان اردن کی طرف چلے آئے۔ دریائے اردن کے مغربی کنارے سے لے کر اردن میں عمان تک مختلف مقامات پر فلسطینیوں کے مہاجرین کیمپ بن گئے۔ پھر یہاں سے فلسطین کی آزادی کے لیے اور اسرائیل کے خلاف لڑنے کے لیے کئی فلسطینی تنظیمیں قائم ہو گئیں جن کے مراکز یہی مہاجرین کیمپ ہوا کرتے تھے۔ یہیں سے فلسطینیوں نے جنوری ۱۹۶۵ء میں اسرائیل پر حملے کیے اور پھر ۱۹۶۷ء میں چھ روزہ جنگ میں اسرائیل نے مغربی کنارے پر قبضہ کر لیا تھا۔ جس کے بعد فلسطینیوں کے مہاجرین کیمپ اردن کے مزید اندرونی شہروں میں منتقل ہو گئے۔

امریکہ و اسرائیل نے جب دیکھا کہ اردن میں فلسطینیوں کے یہ کیمپ اسرائیل اور مغربی طاقتوں کے لیے بڑا خطرہ بنتے جا رہے ہیں اور اردن کے بادشاہ ’شاہ حسین‘ نے بھی محسوس کیا کہ فلسطینیوں کا اثر و رسوخ اردن میں بڑھتا جا رہا ہے، تو امریکہ اور اردن کی حکومتوں نے فیصلہ کیا کہ ان فلسطینی مہاجرین کیمپوں کے خلاف اقدامات کیے جائیں۔ ان اقدامات کے نتیجے میں ۱۹۶۸ء اور ۱۹۶۹ء میں اردنی فوجیوں اور فلسطینی فدائیوں کے درمیان کئی جھڑپیں ہوئی۔

بالآخر امریکہ اور اردن نے فلسطینیوں کے قتلِ عام کا فیصلہ کیا۔ انھی دنوں امریکہ کا آزمودہ کار غلام ضیاء الحق بھی اردن میں پاکستانی فوج کی طرف سے تربیتی مشن کی سربراہی کر رہا تھا۔ امریکہ نے اسے یہ ذمہ داری سونپی۔ ضیاء الحق... جو اس وقت بریگیڈیر تھا... نے اردنی فوج کے کمانڈر انچیف ’حابس المجلّی‘ کے ساتھ مل کر آپریشن کی منصوبہ بندی کی۔ ۱۶ ستمبر کو ضیاء الحق کی سربراہی میں اردنی فوج نے عمان، اِربد، السلط، الزرقاء سمیت کئی شہروں میں فلسطینیوں کے کیمپوں پر ٹینکوں کے ساتھ چڑھائی کر دی اور بے تحاشا بمباری کی۔ کئی دنوں تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ پھر دیگر عرب حکومتوں کی وجہ سے یہ سلسلہ رک گیا۔ بعد ازاں ۲۷ ستمبر کو اردنی

فوج نے دوبارہ حملہ شروع کیا اور فلسطینی مجاہدین کو ’عجلون‘ اور ’جرش‘ کے پہاڑوں تک دھکیل دیا، جہاں بعد میں بے تحاشا بمباری کی گئی۔ یوں دس ہزار سے بیس ہزار تک فلسطینیوں کو ان حملوں کے دوران قتل کیا گیا۔

اس ساری کارروائی کا ماسٹر مائنڈ اور فلسطینیوں کا قاتل ’امریکہ‘ کا وفادار ضیاء الحق تھا۔ اسی کارکردگی کی وجہ سے امریکہ کی آشیر باد سے وہ پاکستان پر گیارہ سال حکومت کرتا رہا۔ ان گیارہ سالوں میں بھی اس نے امریکہ کا خوب حقِ نمک ادا کیا اور ان کے کھینچے ہوئے خطوط پر چلتا رہا۔

افغانستان میں روسی فوجوں کے خلاف ضیاء کی شرکت کی حقیقت

ضیاء الحق کے دور میں جب ۱۹۷۹ء میں روس نے افغانستان پر حملہ کیا تو پاکستان کو یہ خطرہ لاحق ہوا کہ روس افغانستان پر قبضہ کرنے کے بعد بلوچستان پر قبضہ کر کے گرم پانیوں تک پہنچنے کی کوشش کرے گا۔ دوسری طرف امریکی بلاک میں ہونے کی وجہ سے امریکہ بھی یہ چاہتا تھا کہ افغانستان میں روس کو شکست ہو۔ لہٰذا امریکہ کی ایماء اور امداد کے ساتھ ضیاء نے فیصلہ کیا کہ روس کے خلاف لڑنے والے مجاہدین کی مدد کی جائے[49]۔ ہمارے یہاں بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ضیاء اور پاکستانی فوج نے اسلام کی محبت میں روس کے خلاف برسرِپیکار مجاہدین کی مدد کی، حالانکہ یہ سب حقیقت کے خلاف ہے۔ اس کے لیے افسانے بھی گھڑے گئے اور کہا گیا کہ ضیاء الحق اتنا مسلمان ہے کہ تہجد کی نماز بھی اس سے قضا نہیں ہوتی۔ اگر ایسا ہی تھا تو امریکہ کی جھولی میں بیٹھ کر اس جنگ میں شرکت کا کیا معنی۔ اصل بات یہ ہے کہ ضیاء الحق اور پاکستانی فوج... جیسا کہ ہم اوپر بتا آئے... امریکہ کی پوری طرح غلام فوج تھی اور اپنے تمام اقدامات میں امریکی احکامات سے سرِ مو

---

[49] یہاں یہ وضاحت ضروری ہے کہ اس وقت تمام مجاہدین کو امریکہ نے امداد نہیں دی، بلکہ جن گروپوں کی توثیق پاکستان نے کی انھیں یہ امداد دی گئی۔ عرب مجاہدین نے اس امداد میں سے کچھ نہیں لیا اور نہ امریکہ نے انھیں دیا ہے۔ یہ بات خود امریکہ نے بھی واضح کی ہے، اور اس حوالے سے عرب مجاہدین نے بھی اس دور کے احوال لکھے ہیں۔ شیخ ابو مصعب سوری (بقیدِ حیات ہونے کی صورت میں اللہ انھیں رہائی دے، بصورتِ دیگر اللہ تعالیٰ ان پر رحم فرمائے، آمین) نے اپنی کتاب دعوۃ المقاومۃ الاِسلامیۃ العالمیۃ میں اس بابت تفصیل سے کلام کیا ہے، جو چاہے وہاں رجوع کر لے۔ اللہ کی مشیت دیکھیے کہ جن گروپوں نے امریکی امداد لی، وہ بعد میں اقتدار کی ہوس میں خانہ جنگی میں شریک ہوئے، یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے مخلصین کو امیر المومنین ملا محمد عمر رحمہ اللہ کی قیادت میں متحد کر کے غالب کر دیا۔ وما یعلم جنود ربک اِلا ھو!

انحراف نہ کر سکتی تھی۔ اس دور میں یہی ہوا۔ یہاں ہم خود انھی جرنیلوں اور معاملات میں شامل لوگوں کے حوالے سے اصل حقیقت واضح کرنے کی کوشش کریں گے۔

روس کے حملے کے بعد ضیاء الحق نے اپنی کابینہ کی میٹنگ بلائی، جس میں سول افراد نے افغانستان میں روس کے خلاف مداخلت کی مخالفت کرتے ہوئے ضیاء کو اس سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن ضیاء نے امریکی مفادات کے تحفظ اور اشتراکیت کی مخالفت کے سبب جنگ میں مداخلت کی رائے رکھی۔ فوجی افسران اس کی تائید میں تھے۔ اس وقت کے ڈی جی آئی ایس آئی میجر جنرل اختر عبد الرحمن نے اس کی تائید کی اور کہا ہم امریکہ کی پروکسی جنگ افغانستان میں لڑیں گے۔ انھوں نے میٹنگ کے دوران یہ الفاظ تک بولے:

Kabul must burn! Kabul must burn!

"کابل کو ضرور جلنا چاہیے !کابل کو ضرور جلنا چاہیے"!

ضیاء نے اس کام کی ذمہ داری پھر اسی ڈی جی آئی ایس آئی کو سونپی۔ یہ آپریشن بعد میں امریکی سی آئی اے کے 'آپریشن سائیکلون' (Operation Cyclone) کا حصہ بن کر انجام پایا۔ پاکستانی فوج کی طرف سے افغان جنگ میں شرکت کی پوری نگرانی سی آئی اے اور امریکی عہدیداران نے براہِ راست خود کی، جو اس عرصے میں اکثر و بیشتر پاکستان میں ہی تعینات رہے۔ یہ تمام تفصیلات بریگیڈیر جنرل ریٹائرڈ محمد یوسف نے اپنی کتاب Silent Soldier: The Man behind the Afghan Jehad General Akhter Abdur Rahman میں لکھی ہیں۔

خود پاکستانی فوج کے جرنیلوں کی یادداشتوں اور امریکی عہدیداران کی کتابوں کی خوب ورق گردانی کیجیے، یہ تاثر بہت واضح اور باوثوق انداز میں ابھرتا ہے کہ پاکستان کی اس جنگ میں مداخلت کا سبب امریکہ نواز خارجہ پالیسی تھی اور اس پورے دور میں پاکستان کی فوجی حکومت اور خود فوج کے کردار کے پیچھے امریکہ اور اس کے مفادات تھے، نہ کہ اسلام اور مسلمانوں کا تحفظ۔

اس کارکردگی کو واضح کرتے ہوئے پلڈیٹ (PILDAT) نے پاکستان کی خارجہ پالیسی کے حوالے سے جو رپورٹ شائع کی اور اس کا عنوان تھا:-Pakistan's Foreign Policy: an overview 1974

2004۔ اس کے حوالے سے دائرہ معارف ویکی پیڈیا میں درج ہے:

The program relied heavily on the Pakistani President Mohammad Zia ul-Haq, who had a close relationship with Wilson. His Inter-Services Intelligence (ISI) was an intermediary for funds distribution, passing of weapons, military training and financial support to Afghan resistance groups...

”اس (امریکی) پروگرام (یعنی آپریشن سائیکلون) کا مکمل دارومدار پاکستانی صدر محمد ضیاء الحق پر تھا، جس کا امریکی عہدیدار ’ولسن‘ کے ساتھ خصوصی تعلق تھا۔ اُس کی آئی ایس آئی نے امریکی فنڈ اور اسلحے کی تقسیم اور افغان مزاحمتی گروپوں کو عسکری تربیت دینے اور مالی تعاون کرنے میں وسیط کا کردار ادا کیا“۔

یہ بات تو اب اظہر من الشمس ہے کہ اس وقت روس کو شکست دینا امریکہ کی مجبوری تھی جس کے سبب اس نے روس کے خلاف لڑنے والے مجاہدین کے ساتھ تعاون کیا اور اس تعاون کے لیے پاکستان کا واسطہ چنا گیا۔ لیکن یہ بات بھی اظہر من الشمس ہے کہ پاکستان نے اس جنگ میں شرکت اسی امریکی ارادے کے تحت کی اور انھی مقاصد کی خاطر کی جو امریکہ کو مقصود تھے۔ اس کے لیے جنرل اختر عبد الرحمن کا مذکورہ بالا قول ہی کافی ہے جس میں نے اس نے کہا کہ !Kabul must burn اس میں اسلام اور مسلمانوں کی تائید کہاں؟

یہی وجہ ہے کہ جب روس شکست کھا کر بھاگ گیا اور وقت آگیا کہ مجاہدین وہاں اپنی حکومت قائم کریں، اسی آئی ایس آئی نے خانہ جنگی کا منصوبہ بنا کر خانہ جنگی کروائی تاکہ !Kabul must burn ۔ اسی آئی ایس آئی نے احمد شاہ مسعود کی پشت پناہی کی کیونکہ وہ افغانستان میں امریکی مفادات کا محافظ تھا۔ یہ بات خود پاکستانی فوج کے معروف چیلے ’زید حامد‘ نے بارہا بیان کی ہے۔

جنرل ضیاء الحق اور امریکہ کا 'یارانہ'

'سٹیو کول' (Steve Coll) نے اپنی کتاب Ghost Wars; The Secret History of the CIA, Afghanistan and Bin Laden, from the Soviet Invasion to September 10, 2001 میں ضیاء الحق اور اس دور کی امریکی انتظامیہ کی محبت ودوستی کے حوالے سے درج ذیل باتیں ذکر کی ہیں:

- امریکی صدر رونالڈ ریگن خاص طور پر جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء کا حامی تھا۔ اور اس نے ضیاء الحق کی فوجی حکومت کو اس وقت کیمونزم کے خلاف اپنا 'فرنٹ لائن' اتحادی قرار دیا تھا۔
- ریگن دورِ حکومت میں درج ذیل امریکی عہدیداران کا ضیاء کے ساتھ خصوصی تعلق تھا اور یہ لوگ اس دور میں اکثر پاکستان آتے جاتے رہے:
  - حکومتی عہدیداران:
    - سابق امریکی سیکرٹری آف سٹیٹ 'ہنری کسنجر' (Henry Kissinger)
    - ریگن دور میں امریکی کانگریس کا سربراہ 'چارلی ولسن' (Charlie Wilson)
    - 'جوئین ہرنگ' (Joanne Herring)، وہ خاتون جس نے ضیاء اور امریکی حکومت میں قربت پیدا کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا۔

یہ خاتون ضیاء کی بہت چہیتی تھی اور اسے اس درجے محبوب تھی کہ اگر کابینہ کی مجلس کے درمیان بھی اس کا فون آجاتا تو ضیاء مجلس چھوڑ کر اس کی بات سنتا۔ ضیاء دور کے وزیرِ خارجہ جنرل یعقوب خان نے اپنی یادداشتوں میں لکھا ہے کہ she absolutely had his ear, it was terrible 'تعجب خیز بات تھی کہ ضیاء کے کان اسی کے دھیان تھے'۔ ضیاء کے ساتھ اس خاتون کی وابستگی اس وقت سے تھی جب وہ اردن میں بطور بریگیڈیر تعینات تھا۔ اسی تعلق کی وجہ سے ضیاء نے تمام قوانین بالائے طاق رکھتے ہوئے اسے امریکہ میں پاکستانی قونصل خانے کا قونصلر بنادیا، یعنی 'امریکہ' میں پاکستان کا نمائندہ: 'امریکی'! اسی طرح ضیاء نے اسے

پاکستان میں 'تمغہ قائد اعظم' بھی عنایت کیا۔

- o انٹیلی جنس عہدیداران:
  - انڈر سیکرٹری برائے دفاع 'مائیکل پلسبری' (Michael Pillsbury)
  - امریکی خفیہ ادارے سی آئی اے کا افسر 'گسٹ ایوراکٹوس' (Gust Avrakotos)
- o فوجی افسران:
  - چیئرمین جوائنٹ چیفس آف سٹاف 'جنرل ولیم' (William Vessey)
  - جنرل ہربرٹ (Herbert M. Wassom)

- ریگن چونکہ خود بھی امریکہ کے تناظر میں روایت پسند نظریات (American Conservatism) کا حامل تھا، اس نے ضیاء کو بھی تحریض دی کہ وہ اسلام کے روایت پسند ماڈل (Islamic Conservatism) کو اپنی حکومت میں فروغ دے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ضیاء الحق اپنی سابقہ فوجی زندگی میں اور دورِ اقتدار میں امریکہ کے اشاروں پر چلنے والا ایک مہرہ تھا۔ روس کے خلاف سرد جنگ میں امریکہ کی سب سے بڑی خدمت اسی جنرل ضیاء الحق نے کی۔

جنرل ضیاء الحق کا 'اسرائیل' کے ساتھ تعلق

یہ تو ہم اوپر بھی دیکھ آئے کہ ضیاء نے جنرل یحییٰ کے دور میں اردن میں فلسطینیوں پر حملہ کر کے امریکہ و اسرائیل کے ساتھ اپنی خصوصی وابستگی کا اعلان کیا تھا۔ لیکن ہمارے خطے میں بعض حضرات کو یہ شک ہے کہ شاید ضیاء بعد میں توبہ تائب ہو گیا تھا حالانکہ حقیقت ایسی نہیں ہے۔ خود اسی روس کے خلاف جنگ میں ضیاء نے نہ صرف امریکہ کی غلامی کا دم بھرا، بلکہ براہِ راست اسرائیل کی چاکری بھی کی۔ امریکی عہدیدار 'چارلی ولسن' نے ہی بتایا ہے... جو امریکہ اور ضیاء کے درمیان وسیط تھا... کہ ضیاء نے اس آپریشن میں براہِ راست اسرائیلیوں سے بھی تعامل کیا، ان کے ساتھ خفیہ تعلق قائم کیا اور انھیں موقع فراہم کیا کہ وہ روس مخالف جنگ میں شریک ہو سکیں۔ آئی ایس آئی کی مدد سے اسرائیلی خفیہ ادارے 'موساد' نے روسی اسلحے کا توڑ کرنے والا اسلحہ

افغانستان بھجوایا۔ ولسن کے اپنے الفاظ میں ضیاء نے اسرائیلی خفیہ ادارے سے بس اس قدر گزارش کی:

"Just don't put any stars of David on the boxes"[50]

''بس اتنا کرنا کہ اسلحے کے ڈبوں پر داؤدی ستارے کا نشان مت بنانا''۔

ضیاء الحق کی پاکستان میں اسلامائزیشن کی کوششیں

یہاں ہمارا موضوع چونکہ یہ ثابت کرنا ہے کہ اس ملک میں فوج ہی اصل قوت ہے اور یہ قوت امریکہ کے مفادات کی محافظ ہے اور اسی بنا پر یہی قوت اس ملک میں حقیقی اسلام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اس پسِ منظر میں کوئی سوچ سکتا ہے کہ اگر اس ملک میں کسی حکمران نے اسلامائزیشن کی کوشش کی ہے تو وہ صدر ضیاء الحق ہی تو ہے۔ اس لیے ہم یہاں اس پر سرسری نگاہ ڈال لیتے ہیں۔

پہلی بات تو یہ سمجھنے کی ہے کہ یہ مرحلہ اسی دھوکہ دہی کا تسلسل تھا جس کا آغاز پچھلے حکمرانوں نے کر رکھا تھا… جیسا کہ ہم نے پہلے ذکر کیا ہے۔ جنرل یحییٰ کے بعد جب ذوالفقار علی بھٹو بھی اقتدار میں آیا تو کیمونسٹ افکار کا حامل ہونے کے باوجود اس نے بھی اسلامائزیشن کے دھوکے کو جاری رکھا۔ اس نے اپنے دور میں قادیانیت کے کافر ہونے کا قانون پاس کیا اور شراب پینے بیچنے پر اور نائٹ کلبوں پر پابندی بھی لگوائی۔ لیکن یہ تو بھٹو کی طرف سے پاکستان کو سیکولر بنانے کی کوششوں کے مقابلے میں اتنا ہی تھا جیسے آٹے میں نمک، اور مقصود یہی تھا کہ کہیں کھلا کفر دیکھ کر مسلمان مشتعل نہ ہو جائیں۔

اسی مرحلے کو صدر ضیاء الحق نے جاری رکھا، لیکن اس وقت امریکہ کی ضرورت تھی کہ کیمونزم کے افکار کے مقابلے کے لیے اسلام کا نام کھل کر لیا جائے۔ ہم اوپر پڑھ بھی آئے کہ ریگن خود پاکستان میں اسلامائزیشن کا حامی تھا اور اس عمل میں امریکہ کی خوشنودی شامل تھی۔

دوسری بات یہ جانچنے کی ہے کہ ضیاء الحق کے دور میں کس قدر اسلامائزیشن عمل میں آئی!؟ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ واویلا زیادہ کیا گیا اور عمل کم۔ ضیاء الحق کی طرف سے جو اسلامائزیشن کی کوششیں ہوئیں، اس میں

---

[50] The Economist کا ۳۱ جولائی ۲۰۰۳ء کا اداریہ بعنوان: Tricky Diplomacy بحوالہ دائرہ معارف ویکی پیڈیا

بنیادی دو کام ہوئے:

الف) عدالتوں میں شریعہ بینچ بنائے گئے۔

ب) حدود آرڈیننس جاری کیا گیا۔

علمائے کرام جانتے ہیں کہ ان دونوں کی بدولت پاکستان میں کس قدر اسلام آیا۔ جہاں تک شریعہ بینچ کی بات ہے تو اس کے منافقانہ قدم ہونے کی دلیل میں درج ذیل تین باتیں کافی ہیں:

1. شریعہ بینچ کے تمام جج علمائے شریعت نہیں تھے، بلکہ اس میں انگریزی قانون دان بھی شامل تھے۔ بھلا انگریزی قانون دانوں کا اس میں کیا کام؟
2. شریعہ بینچ اپنے فیصلوں میں اتھارٹی نہیں تھا، بلکہ اس کا ہر فیصلہ ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ میں چیلنج کیا جا سکتا تھا اور وہاں خالص انگریزی قانون جاننے والے ججوں کا اقتدار تھا۔ یعنی شریعت کی روشنی میں ایک فیصلہ ہوا لیکن اس کے بعد یہ شریعت سے نابلد انگریزی قانون جاننے والے جج کے سامنے پیش ہو گا اور حتمی فیصلہ شریعت سے نابلد جج کا ہو گا۔
3. شریعہ بینچ کا دائرہ کار بھی محدود تھا، وہ ہر قسم کے معاملات کا فیصلہ نہیں کر سکتا تھا۔

جہاں تک حدود آرڈیننس کا تعلق ہے تو اس کے حقیقی اسلام سے دوری کے لیے بھی تین باتیں کافی ہیں:

1. پہلی بات یہ ہے کہ 'حدود آرڈیننس' میں بہت سی جگہیں ایسی ہیں جو شریعت کے متعین کردہ حدود کے احکامات کے موافق نہیں ہیں، بلکہ اس میں بہت کچھ اضافہ کیا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک پاکستان میں حد تو کوئی نافذ نہیں ہوئی، بلکہ حدود کے تمام مقدمات میں 'حدود آرڈیننس' کے مطابق تعزیرات ہی جاری ہوتی رہی ہیں۔ [51]

[51] شریعت نے جن جرائم کو قابلِ حد قرار دیا ہے، وہاں حد کی سزا متعین ہوتی ہے۔ جب جرم ثابت ہو جائے تو حد ہی نافذ ہوتی ہے اور ثابت نہ ہو تو کوئی سزا نہیں۔ جبکہ یہ عجوبہ ہمارے ملکِ پاکستان میں ہوتا رہا ہے کہ حدود آرڈیننس کے تحت گواہ پورے نہ ہونے کی وجہ سے حد کی سزا تو جاری نہیں ہوتی لیکن گواہوں کے بغیر جرم ثابت کر کے تعزیری سزا دے دی جاتی ہے۔

2. دوسری بات یہ ہے کہ حدود کی سزائیں تو تجویز کی ہیں، لیکن فیصلے کا سارا عمل، گواہوں کی جانچ پڑتال، ثبوت کی فراہمی... سب تعزیراتِ پاکستان کے انگریزی قانون کے مطابق ہے۔
3. فیصلے کرنے کے لیے شریعت سے واقف قاضی متعین نہیں ہوئے، بلکہ انگریزی قانون جاننے والے جج حضرات حدود کے مقدمات کا بھی فیصلہ سناتے رہے۔

اگر حدود آرڈیننس جاری کرنے والے واقعی اسلام لانے کی کوشش کررہے ہوتے تو اولاً قوانین علمائے کرام کی رہنمائی میں بناتے اور ثانیاً ان قوانین کے مطابق فیصلوں کے لیے شریعت جاننے والے قاضیوں کا تقرر کرتے، انگریزی قانون جاننے والے ججوں کو برطرف کرتے۔ پھر کیا وجہ ہوئی کہ اسلام صرف حدود آرڈیننس تک ہی محدود ہوگیا، پورے کا پورا ریاستی ڈھانچہ اور تمام انگریزی قوانین کیوں نہ شریعت کے احکامات سے بدلے گئے۔ معیشت کے حوالے سود کا معاملہ جب اٹھایا گیا تو حکم جاری کردیا گیا کہ اسے اگلے دس سال تک کوئی نہیں چھیڑے گا۔

یہ وہ باتیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ضیاء الحق کے دور میں اسلامائزیشن کی کوششیں بھی ماضی کی طرح محض مسلمانانِ پاکستان کی آنکھ میں دھول جھونکنے کے برابر تھیں اور اصل مقصد معاشرے کی فضا دیکھتے ہوئے ...اسلام کا نام استعمال کرتے ہوئے... اپنے اقتدار کو مضبوط کرنا اور ریاست پر فوجی گرفت مضبوط کرنا تھا۔

جنرل ضیاء الحق کی موت اور جنرل اسلم بیگ کی حکمتِ عملی

اگست ۱۹۸۸ء میں ضیاء اپنے چند سینئر افسروں سمیت ہوائی جہاز کے حادثے میں مارا گیا۔ ملکی حالات فوج کے لیے سازگار نہ رہے تھے۔ پاکستانی عوام فوجی اقتدار سے تھک چکے تھے۔ جنرل ضیاء الحق کا نائب 'وائس چیف آف آرمی اسٹاف' جنرل اسلم بیگ تھا۔ اس نے ضیاء کی موت کے بعد چیف آف آرمی اسٹاف کا عہدہ سنبھال لیا اور بجائے خود اقتدار میں آنے کے، عام انتخابات کرانے کا فیصلہ کیا۔ پاکستان کی تاریخ میں جنرل اسلم بیگ نے جرنیلی حکمتِ عملی تبدیل کی اور طے کیا کہ آئندہ ملکی حالات میں فوج پس پردہ رہتے ہوئے اپنا اقتدار

برقرار رکھے گی اور براہِ راست حکومت میں آنے سے بچے گی۔ یہ حکمتِ عملی بہت کامیاب رہی۔ اگلے گیارہ سالوں میں جرنیلوں نے نام نہاد جمہوری حکومتوں اور حکمرانوں کو سامنے رکھا اور ان کی ڈوریں پس پردہ اپنے ہاتھوں میں رکھیں۔ جنرل اسلم بیگ کے بعد جنرل آصف نواز، جنرل عبد الوحید کاکڑ اور جنرل جہانگیر کرامت اسی حکمتِ عملی پر کاربند رہے۔ پاکستان میں وہی ہوتا رہا جو جرنیلوں نے چاہا، خارجہ وداخلہ پالیسی جرنیلوں کے مطابق چلی۔

گیارہ سال بعد ۱۹۹۹ء میں ایک مرتبہ پھر جنرل پرویز مشرف نے اقتدار اپنے قبضے میں لے لیا۔ ہم چاہتے تو اس تمام دور پر بھی تفصیلی کلام کرتے، لیکن چونکہ یہ قریب کے زمانے کی بات ہے اور ہر پاکستانی مسلمان کے سامنے جنرل پرویز کی حقیقت اچھی طرح واضح ہے، اس لیے یہاں اس پر گفتگو نہیں کر رہے۔ جنرل پرویز نے تو رہی سہی کسر پوری کر دی اور اس نئی صدی میں ’دہشت گردی‘ کے نام پر امریکہ نے جو اسلام و مسلمانوں کے خلاف جنگ شروع کی تو اس میں بھی جنرل پرویز نے پورے پاکستان کو دھکیل دیا۔ یوں اس ملک میں جرنیلوں نے اب امریکی وفاداری میں ’اسلام‘ کے خلاف باقاعدہ جنگ کا آغاز کر دیا اور دینی طبقے کو اپنے نشانے پر رکھ لیا۔ جنرل پرویز کے بعد آنے والے فوجی جرنیل بھی اسی راہ پر چل رہے ہیں اور پوری ریاستی مشینری کو اپنی گرفت میں لے کر انھی خطوط پر چلا رہے ہیں۔

آخری بات؛فوجی جرنیل پاکستان کو سنبھالنے کی اہلیت نہیں رکھتے، بلکہ وہ اس کی تباہی کا باعث ہیں!

آخری اور حتمی بات یہ ہے کہ اس ملکِ پاکستان کو سنبھالنے والے نہ وہ سیاسی خاندان ہیں جو پچھلے ستر سالوں سے اس ملک کی سیاست کا حصہ ہیں اور جنھوں نے ہر چڑھتے سورج کو سلام کیا ہے، اور نہ وہ جرنیل طبقہ ہے جس نے اس ملک کو یرغمال بنا رکھا ہے۔ پاکستان کا تحفظ اور دفاع نہ جمہوریت کے کفری نظام میں ہے اور نہ جرنیلوں کی وردی میں ہے۔ ان دونوں طبقات نے اس ملک کے مسائل کو روز افزوں بڑھایا ہے اور اس ملک کی تنزلی کو بڑھانے میں ہی اپنا کردار ادا کیا ہے۔ ہر مرتبہ جب کسی سیاستدان یا جرنیل کے ہاتھ سے ملکی معاملات

نکلنے لگے، عوام مشتعل ہو کر مخالف ہونے لگے، ادارے باہم گھتم گھتا ہو گئے تو وہ اپنی شکست کا اعتراف کرنے پر مجبور ہوا۔ صدر ایوب خان کا آخری خطاب دیکھیے، جنرل یحییٰ کا آخری خطاب دیکھیے، جنرل ضیاء کو تو خطاب کا موقع ہی نہ ملا اور جنرل مشرف کا آخری خطاب دیکھیے، سب سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ یہ جرنیل طبقہ اس ملک میں اپنی من مانی کر سکتا ہے، ملک کے عوام کو بھیڑ بکریاں سمجھ کر انھیں ادھر ادھر ہانک سکتا ہے، اپنی تجوریاں بھر کر اپنی زندگی کو پر تعیش تو بنا سکتا ہے، لیکن اس ملک کی خوشحالی، ترقی اور یہاں اسلام نافذ کرنے کے معاملے میں کچھ نہیں کر سکتا۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ یہ طبقہ ہزار حب الوطنی کا دعویٰ کرے، لیکن جب مقصود محض اپنی دنیا ہے تو وہ ہر گز مسلمانوں کے مفاد اور ملکی مفاد کا خیال نہیں رکھتا، بلکہ ذاتی مفاد کو ان سب پر ترجیح دیتا ہے۔

جنرل راحیل شریف اور اس کا جانشین 'قادیانیت نواز' جنرل قمر جاوید باجوہ

جو جرنیل بھی آیا اور جس نے بھی سیاستدانوں کو اپنے ڈنڈے سے چلایا، اس نے اس ملک کے حالات مزید دگرگوں کیے، معیشت تباہ کی، بے دینی کو فروغ دیا، اہلِ دین طبقے پر سختی کی اور دین پر عمل کرنا تک دشوار کر دیا، اس ملک کی حقیقی منزل لا الہ الا اللہ کو مزید دور کیا اور امریکہ سمیت عالمی طاقتوں کو کھل کر مظلوم مسلمانوں سے کھیلنے کا موقع دیا... ہاں اگر کوئی مقصد حاصل ہوا تو یہ کہ فوج خوب پھلی پھولی، فوجی معیشت مضبوط ہوئی، جرنیلوں کے سوئس اکاؤنٹ بھر گئے، کور کمانڈرز 'کروڑ' کمانڈرز بلکہ 'ارب' کمانڈرز بنے اور مسلمانانِ پاکستان کو غلام بنانے اور ان کا خون پینے کے لیے مزید چاق و چوبند ہو گئے۔

اس ساری تاریخ کو بیان کرنے کا مدعا یہی تھا کہ ہم بحیثیتِ 'پاکستانی مسلمان' اس امریکہ غلام اور اسلام دشمن فوج کا کردار سمجھ جائیں... اور آج جو میڈیا ایک خبیث انسان جنرل راحیل شریف کو 'سپہ سالار' بنا کر پیش کر رہا ہے اور جس نے ان تین سالوں میں پاکستانی سیاست کو اپنے شکنجے میں لیے رکھا، جس کی حب الوطنی اور ملکی حفاظت کا ڈنکا بجایا جا رہا ہے، اس کا کردار قطعاً اپنے پیش رووں سے مختلف نہیں... بلکہ وہ اپنے پیش رووں سے کئی قدم آگے جا رہا ہے۔

- اس کے پیش روؤں نے تو 'منافقت' کی حد تک اسلام کا نام لیا، لیکن اس نے تو '۲۱ویں ترمیم' پاس کر کے 'اسلام' کو اس ملک میں اچھوت بنا دیا ہے اور 'پاکستان بل' کے نام پر دینداری کو ہی 'جرم' قرار دے دیا۔
- اس کے پیش روؤں نے تو اس ملک کو صرف 'امریکہ' کا غلام بنایا، یہ 'امریکہ' کے ساتھ ساتھ 'چین' کا غلام بنانے پر بھی تل گیا اور ملکی معیشت پر 'چین' کو قبضہ دے دیا۔
- اس کے پیش روؤں نے تو اس ملک پر اپنا تسلط قائم کرنے کے لیے اپنے مخالفین کو محض جیلوں میں ڈالا تھا اور ایک ذوالفقار کا قتل ضیاء کو مہنگا پڑ گیا تھا، لیکن اس نے ملک کے طول و عرض میں اسلام پسندوں اور سیاسی مخالفین کو بڑی تعداد میں ماورائے عدالت قتل کروایا اور یہ سلسلہ ہنوز رکنے کا نام نہیں لے رہا۔
- اس کے پیش روؤں نے تو قبائلی مسلمانوں کو... منافقت سے سہی... اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی، لیکن اس نے پے در پے آپریشن کر کے انھیں بے دریغ قتل کیا اور انھیں دربدری پر مجبور کیا۔ آج کئی لاکھ پاکستانی مسلمان اپنے ہی زمین پر 'مہاجر کیمپوں' میں تنگ دستی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔
- اس کے پیش روؤں نے نام کی حد تک تو اپنے سرکاری کاغذات میں بھارت کو اولین دشمن قرار دے رکھا تھا، اس نے اپنے جانشین جنرل قمر جاوید باجوہ کے ساتھ مل کر فوج کے ڈاکٹرائن میں اولین دشمن ''دہشت گرد'' مجاہدینِ پاکستان کو قرار دیا اور پوری فوج کی ساخت کو پاکستان میں مجاہدین کے خلاف جنگ کے لیے از سرِ نو منظم کیا۔
- اس کے پیش روؤں نے پاکستان میں صحافت پر قدغنیں لگائیں اور کئی ہتھکنڈوں سے ان کی آزادی کو محدود کرنے کی کوشش کی، لیکن اس نے تو پوری ملکی صحافت کو فوج کے آئی ایس پی آر کے تابع فرمان کر دیا۔
- اس کے پیش روؤں نے بھی مذہبی منافرت پھیلانے والے مواد پر پابندی کے تحت قادیانیت کے

خلاف مہم کی روک تھام کی تھی، لیکن اس نے تو 'جہاد' ہی کو منافرت قرار دے دیا اور سیرت و تفسیر تک کی کتابوں پر اُس وطن عزیز 'پاکستان' میں پابندی لگائی جس کا قیام ہی اس وعدے پر وجود میں آیا تھا کہ یہاں قرآن کا قانون اور سیرت کی زندگی ہو گی۔[52]

جنرل راحیل شریف نے تو پاکستان میں اسلام کا جنازہ نکال دیا اور اسلام دشمنی کی تمام حدیں پار کر دیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ اس کا جانشین جنرل قمر جاوید باجوہ جہاں جہاد و مجاہدین دشمنی اور بھارت نوازی میں معروف مشہور ہے، وہاں وہ اگر خود قادیانی نہیں تو قادیانیت نواز ضرور ہے۔ اس کے بارے میں صحافتی دنیا میں یہ باتیں گردش کر رہی ہیں کہ اس کے بیشتر رشتہ دار قادیانی ہیں اور اس کے سربراہ بننے سے پاکستان میں قادیانیت کو فروغ اور قادیانیوں کو قوت ملے گی۔ افسوس کہ پاکستان کا آئین جس طرح اقتدارِ اعلیٰ اللہ تعالیٰ کو سونپنے کے بعد بھی نفاذِ اسلام کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے، اسی طرح قادیانیت کو اقلیت قرار دینے کے باجود پاکستان کو قادیانیت کے قبضے میں دیا جا رہا ہے، اور اس کام کی تمام تر ذمہ داری اسی مکروہ فوج نے اٹھا رکھی ہے۔

'پاکستان' کے حقیقی محافظ اور خیر خواہ 'مجاہدین' ہیں!

مسلمانانِ پاکستان کو جاننا چاہیے کہ وطنِ عزیز میں امن و خوشحالی، فلاح و ترقی اور اس کا تحفظ 'لا الہ الا اللہ' کے نفاذ میں ہے، وہ لا الہ الا اللہ... جس کے لیے ستر سال قبل یہ ملک حاصل کیا گیا تھا۔ یہ وہ شریعت ہے جسے اللہ تعالیٰ نے چودہ صدیاں قبل اپنے پیارے حبیب محمد ﷺ پر نازل کیا تھا۔ پاکستان میں اس تبدیلی اور نفاذِ شریعت کا راستہ 'جہاد' و انقلاب ہے اور پاکستان کی اصل منزل 'لا الہ الا اللہ' کے حصول کے ضامن صرف 'مجاہدین' ہیں جنھوں نے اس سے قبل 'روس' کو شکست دی اور آج 'امریکہ' و 'اسرائیل' سمیت تمام عالمی

[52] جنرل ایوب خان نے اپنے دور میں قادیانیت کو تحفظ دینے کے لیے مذہبی منافرت پھیلانے والے مواد پر پابندی عائد کی تھی۔ جبکہ جنرل راحیل شریف کے دور میں تو حضرت مولانا ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ کی 'سیرت المصطفیٰ'، مولانا یوسف لدھیانوی رحمہ اللہ کی 'آپ کے مسائل اور ان کا حل' اور آیاتِ جہاد کی تفاسیر سمیت بے شمار دینی کتب 'پابندی' کی زد میں آئیں۔

طاقتوں کے مقابل دنیا کے مختلف محاذوں پر ڈٹے ہوئے ہیں، جنھیں دنیا 'القاعدہ' اور 'طالبان' کے نام سے جانتی ہے اور جن کی قیادت امارتِ اسلامیہ افغانستان کے ہاتھ میں ہے۔ پاکستان میں بھی یہی طبقہ مسلمانانِ پاکستان کی امنگوں کا نگہبان ہے اور یہی طبقہ اس ملک میں اسلام و شریعت کے نفاذ کا علمبردار ہے۔ ستر سال گزر جانے کے بعد پاکستان کے اہلِ دین عوام کو جرنیلوں، جاگیرداروں اور جمہوری سیاستدانوں سے مزید دھوکہ نہیں کھانا چاہیے اور اپنی حقیقی منزل اور اس کے حصول کے راستے کو پہچاننا چاہیے۔ اور وہ راستہ پاکستان کے جمہوری نظام کے انہدام اور حکمرانوں اور جرنیلوں کے خلاف زبان و قلم استعمال کرنا، سڑکوں پر نکلنا اور ان کے خلاف قتال کرنا ہے۔

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين!

چین اسرائیل گٹھ جوڑ

ڈاکٹر اکرم حجازی/ تلخیص: حمزہ خالد

حالات کا بدلتا رخ دیکھ کر پاکستانی حکمران اور جرنیل بھی شاید اپنا ایک 'اور' قبلہ بنانے کا فیصلہ کر رہے ہیں۔ افسوس کی بات ہے کہ یہ حکمران اور فوجی قائدین اب بھی اپنے خالق کی چوکھٹ پر سجدہ ریز ہونے کی بجائے کسی اور صنم کی تلاش میں ہیں، کسی اور کی غلامی کا طوق گلے میں ڈالنے کے لیے بے قرار ہیں۔ **'سی پیک'** کے نام پر نہ صرف گوادر کی بندرگاہ... طشت میں سجا کر... چین کو دے دی گئی ہے، بلکہ چین کی سرحد سے گوادر تک 'شاہراہ' کے قیام کا منصوبہ بنا کر پاکستان کا مغربی کنارہ بھی چین کی گود میں ڈال دیا گیا ہے۔ جن گرم پانیوں تک روس کی رسائی روکنے کے لیے مجاہدین اور افغان قوم نے لاکھوں قربانیاں دیں؛ انہی پانیوں کو خود ہی بلا مزاحمت چین کے حوالے کر دیا گیا ہے! پھر اپنا آدھا ملک بیرونی قوت کے حوالے کرنے کے بعد قوم کو یہ فضائل سنائے جا رہے ہیں کہ اس سے لاکھوں لوگوں کو روزگار ملے گا۔ سبحان اللہ! کیا غیرت مند قومیں اپنی زمین کے سودے اسی طرح کیا کرتی ہیں؟ کیا مسلمان کے لیے روزگار سے قیمتی کوئی شے نہیں ہوتی؟ یہ 'سی پیک' کا معاہدہ آخری کیل کے طور پر ٹھونکا جا رہا ہے اور اس ملک کی عوام کی گردنوں پر 'امریکہ بہادر' کے ساتھ ساتھ ایک نئے 'دشمن' کو مسلط کیا جا رہا ہے۔ اس ملک کی 'معیشت' اور 'زمین' پر قبضہ حاصل کرنے کے بعد چین نے یہاں وہی کچھ کرنا ہے جو عالمی کفری طاقتوں کو مطلوب ہے اور جس کی زمام 'اسرائیل' کے ہاتھ میں ہے۔ 'سی پیک' اور گزشتہ چند سالوں میں پیش آنے والے واقعات سے اس خطے کے مستقبل کی تصویر کے خدوخال کچھ کچھ نمایاں ہونے لگے ہیں:

- اولاً خانیوال کے قریب چین اور پاکستان کی مشترکہ فوجی مشقوں کا انعقاد کیا گیا جن کے بعد اس وقت کے جرنیل اشفاق پرویز کیانی نے چین کو اپنی وفاداری کا یقین دلانے کے لیے پہلی بار نام لے کر 'حزبِ

اسلامی ترکستان' سے اپنی عداوت کا اعلان کیا اور ان کے خلاف ماضی کی طرح اپنی کارروائیاں جاری رکھنے کے عزم کا اظہار کیا۔ یاد رہے کہ 'حزبِ اسلامی ترکستان' چین کے زیرِ قبضہ مسلم خطے کی بازیابی اور وہاں کے مظلوم مسلمانوں کو چینی فوج کے وحشیانہ مظالم سے بچانے کے لیے بر سرِ پیکار ایک جہادی تنظیم ہے۔ چین کا دعویٰ ہے کہ اس تنظیم کی قیادت اور بنیادی تربیتی ڈھانچہ افغانستان اور پاکستان کی سرحدی پٹی میں واقع ہے۔

- فوجی مشقوں کے اختتام پر چین کے فوجی قائدین نے بھی یہ اطمینان دلایا کہ اگر پاکستان چینی مظالم کے خلاف جہاد کرنے والوں کو نشانہ بناتا رہے تو چین بھی پاکستان کے ساتھ دفاعی میدان میں طویل المیعاد 'شراکت' کے لیے تیار ہے۔ اس ملک کے عوام گزشتہ دس سال میں بخوبی دیکھ ہی چکے ہیں کہ سات سمندر پار بیٹھے امریکی کافر کے ساتھ 'شراکت' نے اہلِ پاکستان کو کیا دیا ہے، لہٰذا یہ تصور کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں کہ ہمارے عین سر پر بیٹھے دیو ہیکل چینی کافر سے 'شراکت' ہمیں کیسی غلامی کی طرف دھکیلے گی؟
- ان فوجی مشقوں کے معاً بعد پاکستان کے قبائلی علاقہ جات میں ڈرون حملوں کا سلسلہ پھر سے شروع ہو گیا، حالانکہ یہ سلسلہ سلالہ کے واقعے کے بعد سے رکا ہوا تھا۔ اور اب کی بار ابتدائی تین بمباریوں میں سے دو میں حزبِ اسلامی ترکستان کے مجاہد بھائیوں کو نشانہ بنایا گیا، اللہ تعالیٰ ان کی شہادت قبول فرمائے۔ آمین! یاد رہے کہ یہ کوئی پہلا موقع نہیں کہ پاکستانی فوج ہمارے مظلوم ترکستانی بھائیوں کو نشانہ بنا رہی ہے۔ اس سے قبل سن ۲۰۰۴ء میں حزب کے امیر شیخ ابو محمد ترکستانی رحمہ اللہ کو بھی پاکستانی فوج نے جنوبی وزیرستان کے ایک پہاڑی علاقے میں چھاپہ مار کر شہید کیا تھا۔ نیز سال ۲۰۱۰ء اور ۲۰۱۱ء میں بھی ترکستانی بھائیوں کو بطورِ خاص ڈرون حملوں کا ہدف بنایا گیا۔ اور پاکستان کے خفیہ قید خانوں میں بند ترکستانی بھائیوں اور بہنوں کی المناک داستان تو اتنی طویل ہے کہ ہم اس مختصر سے مضمون میں اس کا تذکرہ چھیڑنے کے متحمل نہیں ہو سکتے۔
- انھی سالوں میں سندھ کے تمام سرکاری سکولوں میں چینی زبان کی تعلیم کو لازمی قرار دینے کا فیصلہ بھی سامنے آیا جو سبھی کے لیے انتہائی غیر متوقع تھا۔ ہر صاحبِ فہم شخص یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ ہمیں بتدریج اپنے نئے آقا سے مانوس کروایا جا رہا ہے اور سالہا سال مغربی کافروں کی

تہذیبی غلامی کے بعد اب ہماری آئندہ نسلوں کو مشرقی کافر کی تہذیبی غلامی کے لیے ذہناً تیار کیا جارہا ہے؟

- اسی عرصے کے دوران چین نے ہمارے ساتھ اپنی 'ہمالیہ سے بلند دوستی' کا فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ مطالبہ بھی کر ڈالا کہ اسے ہمارے شمالی علاقہ جات میں ایک مستقل فوجی اڈہ بنانے کی اجازت دی جائے۔ یاد رہے کہ شمالی علاقہ جات میں آغاخانی ریاست کی راہ ہموار کرنے کے لیے پہلے ہی گلگت بلتستان کو ایک الگ صوبے کی حیثیت دی جاچکی ہے۔ آغاخانی طبقے کی تو تاریخ ہی یہ ہے کہ اس نے ہمیشہ مسلمانوں کے خلاف کافروں کا ساتھ دیا ہے، لہٰذا یہ طبقہ چین کے ہر ایسے مطالبے کا حامی ہو گا جس کے تحت چین کو شمالی علاقہ جات میں قدم جمانے کا موقع مل سکے۔
- پھر اس سے بھی زیادہ تشویش کی بات یہ ہے کہ اس ملک کی بعض معروف دینی جماعتیں 'پاک چین دوستی' کا نعرہ بلند کرنے میں حکومت سے بھی دو قدم آگے کھڑی نظر آرہی ہیں۔ مطلوب تو یہ تھا کہ اس بدلتی صورتِ حال کو ایمانی پیمانوں سے جانچ کر شریعت سے موافق کوئی موقف اختیار کیا جاتا، ایک کروڑ مظلوم ترکستانی مسلمانوں کے زخموں پر مرہم رکھا جاتا اور اہلِ پاکستان کو چین کی غلامی کی بجائے تنہا اللہ کی غلامی کی راہ دکھلائی جاتی، لیکن افسوس کہ معاملہ بالکل اس کے برعکس ہو رہا ہے۔ چند سال قبل ایک معروف دینی جماعت کی مرکزی قیادت پر مشتمل ایک وفد نے چین کا دورہ کیا اور چین کی حکمران جماعت اور کئی ایسے نمایاں سرکاری عہدیداران سے ملاقات کی جو ترکستانی مسلمانوں کا خون بہانے میں پیش پیش تھے۔ اس کے بعد چین کی طرف سے بھی کئی اعلیٰ سطحی وفود نے اس جماعت کے لاہور میں واقع مرکز کا دورہ کیا۔ ان تمام دورہ جات اور ملاقاتوں کے دوران چین کے ہاتھوں ترکستانی مسلمانوں کی نسل کشی پر کمال بے حسی کے ساتھ مکمل سکوت اختیار کیا گیا! انا اللہ وانا الیہ راجعون!

یاد رکھیے کہ پڑوسی ہونے کے ناطے 'ترکستانی' مسلمانوں کا ہم پر بہت بھاری حق بنتا ہے۔ مسند احمد میں مروی حدیث کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

"ومن كان يؤمن بالله واليوم الآخر فليحفظ جاره"۔

"جو کوئی اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتا ہو اسے چاہیے کہ اپنے پڑوسی کی حفاظت کرے"!

اسی سارے منظر نامے کو سامنے رکھتے ہوئے ضروری محسوس کیا گیا کہ اس ملک کے عام مسلمانوں اور بالخصوص اس کے اہلِ دین طبقات کو چین کی خطرناکی سے آگاہ کیا جائے [1]۔ ذیل میں ہم عالمِ عرب کے ایک معروف تجزیہ نگار و مصنف ڈاکٹر اکرم حجازی کے مضمون "الصين تحت مجهر السلفية الجهادية" کی تلخیص قارئین کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ اس مضمون سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ امریکہ کی گود سے اتر کر چین کے قدموں میں جا بیٹھنے کے لیے بے قرار حکمران اور فوجی جرنیل چین کی جو 'مسلمان دوست تصویر' عموماً پیش کرتے ہیں وہ بالکل خلافِ واقع ہے۔ چین کے اسرائیل کے ساتھ انتہائی گہرے روابط ہیں اور مستقبل قریب میں یہ خطرہ ہمارے سروں پر واضح طور پہ منڈلا رہا ہے کہ اسرائیل کی حفاظت و پشت پناہی کا جو کردار آج تک امریکہ نے سنبھالے رکھا ہے، وہ کردار شاید جلد ہی چین کو منتقل ہو جائے۔

چین اسرائیل تعلقات کی تاریخ

چین اور اسرائیل کے تعلقات کی ابتداء

اسرائیل مشرقِ وسطیٰ کا وہ پہلا ملک تھا جس نے عوامی جمہوریہ چین کو (۹ جنوری ۱۹۵۹ء کو) تسلیم کیا۔ اس وقت سے کئی لوگ دیوارِ چین کے پار اسرائیلی نفوذ کے متعلق چہ مگوئیاں کر رہے ہیں۔

اگر ہم چین اسرائیل تعلقات کی تاریخ کا جائزہ لیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ پچاس کی دہائی میں دونوں ممالک کے درمیان تعلقات کشیدہ رہے۔ البتہ چین کے معروف رہنما 'ماؤزے تنگ' کی موت کے بعد اور بالخصوص ۱۹۷۹ء کی ابتداء سے دونوں ممالک کے درمیان تعلقات میں بہتری آئی۔ ایسا کیوں ہوا؟ سادہ الفاظ میں یوں سمجھ لیجئے کہ چین ٹیکنالوجی کے اعتبار سے ایک کمزور ملک تھا۔ اس کی فوج پسماندہ اور عسکری اعتبار سے اس حد تک کمزور تھی کہ ۱۹۷۸ء کی چین ویتنام جنگ میں چینی فوج ویتنام جیسے چھوٹے ملک کی فوج کے سامنے بھی نہیں ٹِک سکی۔ اس جنگ میں روس نے ویتنام کا ساتھ دیا جس کے نتیجے میں چین اور

[1] ہم اس سے قبل حطین کے پانچویں شمارے میں "چین؛ ایک دوست ملک؟" کے عنوان سے ایک مضمون چھاپ چکے ہیں جس میں مشرقی ترکستان کے مسئلے کا مفصل تعارف بھی کروایا گیا ہے اور چین کے مظالم پر سے پردہ بھی اٹھایا گیا ہے۔

سوویت اتحاد کے درمیان پہلے سے موجود اختلافات مزید شدت اختیار کر گئے۔ نتیجتاً چین دو مشکلات کے درمیان پھنس کر رہ گیا۔ ایک طرف ٹیکنالوجی کے میدان میں چین کی کمزوری اور مغرب کی جانب سے چین سمیت تمام اشتراکی ممالک کو اسلحے کی فروخت پر پابندی تھی، تو دوسری طرف سوویت اتحاد کے ساتھ چین کے اختلافات تھے۔ چنانچہ اسلحے کی خریداری کے لیے چین کے پاس نہ ہونے کے برابر ذرائع رہ گئے۔ چونکہ مغربی ممالک کی ٹیکنالوجی مشرقی ممالک بشمول چین کی ٹیکنالوجی سے کہیں درجے بہتر ہے لہذا چین اس بات پر مجبور ہو گیا کہ وہ اپنے نظریے کو اٹھا کر ایک طرف رکھ دے اور اپنے متکبرانہ موقف سے پیچھے ہٹتے ہوئے اپنی سرحدوں کی حفاظت اور اپنی فوج کی مضبوطی کو ترجیح دے۔ چین نے اسرائیل کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے کا فیصلہ کیا اور یہ فیصلہ بنیادی طور پر چینی فوج کو جدید بنانے اور اس کو ضروری عسکری سامان دلوانے کی خاطر کیا گیا۔ اگرچہ نظریات کے اعتبار سے چین اور اسرائیل ایک دوسرے کے مخالف کیمپ میں تھے لیکن چونکہ اسرائیلی اسلحہ اپنے معیار کے اعتبار سے کسی طور بھی امریکی اسلحے سے کم نہیں تھا، اس لیے چین کی نگاہِ انتخاب اس پر پڑی۔ اب چین اسرائیل کے پہلے وفد کے استقبال کے لیے تیاریاں کرنے لگا۔

چین اسرائیل تعلقات پر امریکہ کی تشویش

تعلقات کی ابتداء کے بعد دونوں ممالک کے وفود کے درمیان ملاقاتوں کا یہ سلسلہ چلتا رہا تا آنکہ طرفین کے درمیان باقاعدہ معاہدات طے پانا شروع ہو گئے۔ ۹۰ء کی دہائی کے آغاز میں 'میڈرِڈ امن کانفرنس' کے بعد چین اور اسرائیل کے درمیان اعلانیہ سفارتی تعلقات کے قیام کا اعلان ہوا ہی تھا کہ دونوں ممالک کے درمیان عسکری تعاون امریکیوں کے لیے پریشانی کا باعث بن گیا۔ امریکہ نے اس عسکری تعاون کی تفصیلات جاننے کے لیے اپنے وفود اسرائیل بھیجے اور امریکہ اور اسرائیل کے درمیان ہنگامی دو طرفہ ملاقاتیں ہوئیں۔ ان ملاقاتوں کے نتیجے میں ایسے دوطرفہ معاہدے طے پائے جن کے تحت امریکہ نے اسرائیل پر اسلحہ برآمد کرنے پر پابندی لگا دی کیونکہ اس سے وسط ایشیا اور جنوبی ایشیا میں امریکہ کی قوت اور رعب پر منفی اثرات پڑ رہے تھے۔ اس بات کا اعتراف اس وقت کے اسرائیلی وزیرِ خارجہ سالوین شالوم نے بھی کیا۔ اسرائیل، جو دنیا میں اسلحے کی کل برآمدات میں سے دس فیصد کا مالک ہے، نے آخر ایسا کون سا

اقدام اٹھایا تھا جو امریکی ناراضی کا سبب بنا؟

امریکہ وروس کی تشویش کے اسباب

یہ بات یقینی ہے کہ سوائے چند مخصوص افراد اور اداروں کے، کوئی شخص دنیا کے بڑے ممالک کے مابین اسلحے کی خرید و فروخت اوران کی عسکری تیاریوں کے بارے میں مکمل معلومات نہیں رکھتا۔ ہمارے پاس جو معلومات ہیں وہ وہی ہیں جو ان ممالک نے خود ظاہر کیں یا جن کا ان ممالک کے درمیان طے ہونے والے معاہدات سے پتا چلتا ہے۔ چین اور اسرائیل کے درمیان ہونے والے معاہدات سے معلوم ہوتا ہے کہ چین نے اسرائیل سے درج ذیل ساز وسامان خریدا تھا:

- بغیر پائلٹ کے اڑنے والے ہاربی طیارے
- بیلسٹک میزائیلوں کے خلاف دفاع کے آلات
- ٹینک شکن میزائیل
- دشمن کی نقل و حرکت کی بروقت اطلاع دینے والے آلات سے لیس ایواکس (AWACS) طیارے
- اندھیرے میں دیکھنے کی صلاحیت والی دوربینیں
- الیکٹرانیاتی جنگ لڑنے کے آلات
- اور ملکی سرحدات کی پہرے داری میں مدد دینے والے جدید آلات۔

اس حقیقت پر سے سب سے پہلے ٹاس نیوز ایجنسی نے پردہ اٹھایا اور جنوری ۱۹۸۰ء میں ریڈیو ماسکو نے اعلان کیا کہ اسرائیل چینی فوج کو ایک جدید فوج بنانے کے لیے تیزی سے مدد فراہم کر رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ چین کو جدید ترین عسکری ٹیکنالوجی وساز وسامان کی اس تیزی سے منتقلی امریکہ کے لیے خطرے کی گھنٹی تھی اور وہ کسی قیمت پر بھی طاقت کا یہ بدلتا ہوا توازن قبول کرنے پر تیار نہیں تھا۔ اسی لیے اس نے اسرائیل چین تعلقات میں مداخلت ضروری سمجھی۔ دوسری جانب سوویت اتحاد بھی چین اور اسرائیل کے بڑھتے ہوئے تعلقات کا بغور جائزہ لے رہا تھا اور تشویش کا شکار تھا۔

چین کو جدید عسکری قوت بنانے میں اسرائیل کا کردار

لیکن تمام تر تشویش اور وقتی تعطل کے باوجود چین اسرائیل دفاعی تعاون بحیثیتِ مجموعی جاری رہا۔ ۱۹۸۵ءمیں چین کے پاس موجود روسی ساخت کے ٹی۔ ۶۲ ٹینک کو اَپ گریڈ کرنے (بہتر بنانے) کا معاہدہ طے پایا جو کہ چین و اسرائیل کے درمیان پہلا اہم دفاعی معاہدہ تھا۔ اس معاہدے کے تحت چین نے اس ٹینک میں اسرائیلی ساخت کی ۱۰۵ ملی میٹر توپ نصب کی۔ اس معاہدے میں ریڈار کے اصول پر کام کرنے والے مواصلاتی آلات، فضا سے فضا میں مارے جانے والے میزائیلوں کے خلاف دفاعی نظام، آگ بجھانے کے آلات، رات کو دیکھنے والی لیزر اور انفراریڈ دوربینیں اور ہدف کی نشان دہی کرنے اور اسے ٹھیک ٹھیک نشانہ بنانے کے لیے استعمال ہونے والے برقیاتی آلات کی فراہمی بھی شامل تھی۔ اس بات کے شواہد بھی ملتے ہیں کہ اسرائیل کے فنی عملے نے چین کے پاس موجود ٹینک شکن گولوں میں یہ قابلیت پیدا کی کہ وہ روسی ٹینکوں کی بیرونی آہنی چادر چیر سکیں۔

۱۹۸۳ءمیں ایک فرانسیسی اخبار نے یہ خبر شائع کی کہ: "۲۰۰ اسرائیلی فوجی ماہرین چینی فوج کی تجدیدِ نو کے عمل میں مدد فراہم کر رہے ہیں"۔ دیگر ذرائع سے یہ خبریں بھی سامنے آئیں کہ روس کے ساتھ ملنے والی ۶۶۷۹ کلومیٹر طویل چینی سرحد پر ایک دفاعی حصار کھڑا کرنے میں اسرائیل خفیہ مدد فراہم کر رہا ہے۔ اربوں ڈالر کے اس منصوبے پر عمل درآمد کے لیے کئی سو (۱۰۰) اسرائیلی ماہرین ایک سال سے کام کر رہے تھے۔ غیر ملکی ذرائع نے اس بات کی بھی تصدیق کی کہ اسرائیلی ماہرین درمیانے فاصلے تک مار کرنے والے اور دور مار چینی میزائیلوں کو جدید بنانے میں بھی مصروف ہیں۔ مغربی عسکری ذرائع نے اس بات کا بھی ذکر کیا کہ چین نے ۱۹۹۰ء میں اسرائیل کے تعاون سے اپنے ایک بحری میزائیل کو بھی بہتر بنالیا ہے۔ یہ میزائیل اسرائیل کے 'جبرائیل' نامی میزائیل کی طرز پر بنایا گیا تھا۔ اس کے علاوہ 'لافی' نامی اسرائیلی طیارہ، جس کی پیداوار کے منصوبے پر اسرائیل نے کام بند کر دیا تھا، اس طیارے میں استعمال ہونے والے برقیاتی نظام کو ایک معاہدے کے تحت چین میں تیار ہونے والے لڑاکا طیاروں کی نئی نسل میں شامل کر دیا گیا۔ لافی طیارے میں نصب مواصلاتی نظام اور طیارے کی سمت کو کنٹرول کرنے والے نظام میں چینیوں کی خاص دلچسپی تھی کیونکہ وہ یہی نظام اپنے 'ایف۔ ۱۰' لڑاکا طیارے میں بھی نصب کرنا چاہتے تھے۔

عسکری امور کے رسالے جینز ڈیفنس ویکلی(Janes Defence Weekly)نے ۱۹۸۶ء میں اس بات کی تصدیق کی کہ اسرائیل نے چین کو 'مافتس' نامی ٹینک شکن میزائیل بھی فراہم کیے۔ اسی طرح اسرائیل نے چین کو فضا سے فضا میں مار کرنے والے میزائیل 'پائیون۔۳'کی ٹیکنالوجی بھی دی۔ یہ میزائیل، امریکی میزائیل 'سائیڈ وائینڈر' کی طرز پر بنایا گیا ہے۔ سی آئی اے کے مطابق اسرائیل نے چین کو میزائیل کی پرواز اور سمت کے کنٹرول(system guidance) کے حوالے سے انتہائی حساس معلومات منتقل کیں، بالخصوص 'پیٹریاٹ میزائیل' میں نصب نظام کے متعلق فنی معلومات بھی منتقل کیں۔ ۱۹۹۰ء کی دہائی میں چین اور اسرائیل کے درمیان ایواکس (AWACS) جاسوس طیارہ ۲۵۰ ملین ڈالر میں چین کو فراہم کرنے کے لیے مذاکرات شروع ہوئے۔ محتاط اندازوں کے مطابق ۹۰ء کی دہائی کے آخر تک اسرائیل کی طرف سے چین کو بیچے جانے والے اسلحے کی کل مالیت سات(۷)ارب ڈالر تک پہنچ گئی تھی۔ امریکہ کی جاری کردہ ۲۰۰۴ء کی ایک رپورٹ کے مطابق اسرائیل روس کے بعد سب سے زیادہ اسلحہ چین کو فروخت کرتا ہے۔

نیز چین نے محض اس پر اکتفا نہیں کیا کہ وہ اسرائیل کی ٹیکنالوجی، دفاعی معلومات اور عسکری علوم میں مہارت پر اعتماد رکھتے ہوئے اس سے بنا بنایا اسلحہ خرید تا جائے، بلکہ اسرائیل سے یہ مطالبہ بھی کیا کہ وہ چین کو تکنیکی معلومات اور ٹیکنالوجی بھی فروخت کرے تاکہ چینی خود بھی جدید ترین اسلحہ بنانے کی صلاحیت پیدا کر سکیں۔ لہٰذا چین نے اسرائیل سے کچھ انتہائی جدید نوعیت کی ٹیکنالوجی لینا شروع کی۔ اس میں ریڈار کا نظام، میزائیلوں میں سمت کے تعین کا نظام، لڑاکا طیاروں اور میزائیلوں میں نصب ہونے والا ریموٹ کنٹرول نظام اور ہوشیار ہتھیاروں(smart weapons) سے متعلقہ ٹیکنالوجی بھی شامل تھی۔ یوں چین اسرائیل کے ذریعے بالواسطہ امریکہ کی جدید ترین ٹیکنالوجی کے حصول کے لیے کوشاں رہا اور اس میں قدرے کامیابی بھی حاصل کی۔

کچھ دیگر ذرائع یہ بھی بتاتے ہیں کہ چین اور اسرائیل نے ایک معاہدے کے تحت ایک مالیاتی فنڈ قائم کیا۔ اس فنڈ کے ذریعے ایک امریکی کمپنی کو ۱۵۰ ملین ڈالر کی سرمایہ کاری پر آمادہ کیا گیا جس کا مقصد ایک چینی یونیورسٹی کے ساتھ دفاعی تحقیق کے میدان میں تعاون تھا۔ اس تحقیق کا مقصد اسرائیل میں عسکری

علوم اور ٹیکنالوجی کے میدان میں کام کرنے والے اداروں کی اس شرط پر مدد کرنا تھا کہ وہ اس ٹیکنالوجی کو چینی مارکیٹ میں متعارف کروائیں گے۔ اسی طرح ایک اسرائیلی کمپنی اور ایک چینی کمپنی کے مابین ۷۵ ملین ڈالر مالیت کا سرمایہ کاری کا معاہدہ بھی ہوا۔ یوں چین نے مواصلاتی ٹیکنالوجی، عسکری علوم، دفاع، زرعی ٹیکنالوجی، بنیادی ریاستی ڈھانچے اور قومی سلامتی کے میدان میں تعاون کے ذریعے اسرائیل سے انتہائی مضبوط تعلقات قائم کر لیے۔ اسی گہرے تعلق کی ایک مثال یہ بھی ہے کہ چین میں ۲۰۰۸ء میں منعقد ہونے والی اولمپک کھیلوں کے حفاظتی انتظامات کے حوالے سے بھی اسرائیل نے اپنی تمام تر خدمات چین کو پیش کیں۔

چین اسرائیل تعلقات سے یہود کو حاصل ہونے والے فوائد

چین میں یہود کا اثر ورسوخ

ظاہر ہے کہ یہودی یہ سارا تعاون چین کی محبت میں نہیں کر رہے تھے بلکہ ان کے اپنے بھی کچھ اہداف ومفادات تھے جنہیں وہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اسرائیل نے چین کے ساتھ اپنے تعلق سے جہاں ایک طرف سیاسی، مالی اور سائنسی میدان میں فوائد اٹھائے، وہیں چین کے اندر ثقافتی، تحقیقاتی، دینی اور تعلیمی اداروں کے قیام کے ذریعے یہودی سرگرمیوں کو بھی فروغ دیا۔ ۱۹۹۱ء میں چین کے ایک تعلیمی وفد کے دورۂ اسرائیل کے موقع پر دونوں ممالک نے اپنے تعلیمی اداروں کے مابین تعاون کے لیے دوطرفہ معاہدہ کیا۔ اس سے قبل ۱۹۸۶ء میں چین کی بیجنگ یونیورسٹی میں عبرانی زبان، عبرانی ادب، یہودی تاریخ اور یہودیت کی تعلیم کے لیے ایک باقاعدہ شعبہ پہلے ہی کھولا جا چکا تھا۔ اسی طرح اسرائیل نے بیجنگ میں ایک تحقیقاتی مرکز بھی کھولا جس میں چینی کتابوں کے عبرانی زبان میں ترجمے پر کام شروع کیا گیا۔ ۲۰۰۴ء میں اخبار 'آج کا چین' میں 'چین کے یہودیوں' کے عنوان سے ایک مضمون چھپا جس میں صاحبِ مضمون نے چین میں یہودی سرگرمیوں سے متعلق چند اہم حقائق پر سے پردہ اٹھایا۔ اس نے اپنے مضمون میں لکھا کہ چینی حکومت کی مرکزی مجلسِ مشاورت کے دو اہم ارکان، اسرائیل ابشیتائین اور سڈنی شاپیرو، درحقیقت نسلاً یہودی ہیں۔ مضمون میں چین میں رہنے والی بہت سی اہم یہودی شخصیات کی طرف بھی اشارہ کیا گیا جن میں ساسون اور قادوری خاندان کے افراد کے علاوہ سابق امریکی وزیرِ خزانہ مایک بلومنشال، ہانگ کانگ سے

چھپنے والے معروف رسالے 'فار ایسٹرن اِکنامک ریویو' کے بانی ایرِک ہالبرن اور چین کی جمہوری انقلابی پارٹی کے صدر صوت یان سن کا سابق محافظِ خاص موریس کوہن وغیرہ بھی شامل ہیں۔

چین کی طرف یہودیوں کی ہجرت

اسی مضمون میں چین کی طرف یہودیوں کی ہجرت کی تین بڑی لہروں کی طرف اشارہ کیا گیا۔ پہلی لہر سن ۱۸۴۲ء میں 'افیون کی جنگوں'(opium wars) کے معاہدات کے بعد شروع ہوئی جب چین نے اپنی بہت سی بندرگاہیں تجارت کے لیے کھول دی تھیں۔ ان بندرگاہوں میں شنگھائی کی بندرگاہ بھی شامل تھی جہاں مغربی ایشیا اور بالخصوص بغداد سے یہودی تاجروں کا ایک وفد آیا۔ اس وفد میں ساسون اور قادوری خاندان کے افراد بھی شامل تھے جو بعد میں مستقل ہانگ کانگ میں رہائش پذیر ہو گئے۔ اس خاندان کے افراد مختلف ہوٹلوں اور متعدد بڑے کاروباروں کے مالک ہونے کے ناطے ہانگ کانگ کے امیر ترین لوگ بن چکے ہیں۔ ہجرت کی دوسری لہر روس کے یہودیوں پر مشتمل تھی جو ۱۹۱۷ء کے اشتراکی انقلاب کے بعد روس چھوڑ کر چین آگئے۔ تیسری لہر ۱۹۳۷ء اور ۱۹۳۹ء کے درمیان دوسری جنگ عظیم کے آغاز پر اٹھی جب ۲۰ ہزار یہودی ہٹلر کے خوف سے بھاگ کر چین آگئے۔ ۱۹۱۰ء میں چین میں بسنے والے یہودیوں کی تعداد صرف ۱۵۰۰ تھی جو 'ہیلون ژیانگ' کے مرکزی شہر ہارپن میں رہائش پذیر تھے، لیکن ۱۹۲۹ء تک یہی تعداد بڑھ کر تیرہ ہزار (۱۳،۰۰۰) تک پہنچ گئی اور اس کے بعد اس میں بدستور اضافہ ہوتا رہا۔ ان یہودیوں کی بڑی تعداد ۳۰ء کی دہائی میں جاپان کی جانب سے منچوریا (شمالی چین) کے علاقوں پر قبضے کے بعد چین کے ایک اہم شہر شنگھائی منتقل ہو گئی۔

چین میں یہود کی تجارتی سرگرمیاں

ہجرت کر کے آنے والے یہودیوں میں سے بیشتر نے ہمیشہ کی طرح تجارت اور مالی سرگرمیوں کے میدان میں اپنے آپ کو نمایاں کیا۔ مذکورہ بالا مضمون میں ذکر کیا گیا ہے کہ ۱۹۳۲ء تک شنگھائی بازارِ حصص میں کل ایک سو (۱۰۰) سرمایہ کاروں کا اندراج ہوا تھا جن میں سے چالیس (۴۰) یہودی تھے۔ آج قادوری یہودی خاندان سے تعلق رکھنے والا ایک فرد ہانگ کانگ کی سب سے زیادہ بااثر شخصیات میں شمار ہوتا ہے۔

چین میں یہود کی علمی وثقافتی سرگرمیاں

آج چین کے بڑے شہروں میں یہودی ثقافت کی علامتیں ظاہر ہونا شروع ہو گئیں ہیں۔ مثلاً یہودی انجمنیں، یہودی کلب، قہوہ خانے، مذہبی سرگرمیوں کے مراکز اور تعلقاتِ عامہ استوار کرنے کے ادارے۔ شنگھائی میں یہودی سرگرمیاں چین کے دارالحکومت بیجنگ سے بھی دو ہاتھ آگے ہیں۔ یہاں یہودیت پر تحقیق کے لیے مختلف ادارے کھل چکے ہیں، جن میں ایک ادارہ 'نان جینگ یونیورسٹی' میں مئی ۱۹۹۲ء میں کھلا۔ اس شعبے کا سربراہ پروفیسر شو شین ہے، جو اسی یونیورسٹی کے شعبہء تعلقاتِ خارجہ میں پڑھاتا ہے اور یہودیت کی نشر و اشاعت میں مشغول سب سے سرگرم شخصیات میں شامل ہے۔ یہ شعبہ یہود کی تاریخ پر سالانہ دورے کرواتا ہے جس میں ہر سال ۲۰۰ سے زائد طلباء شریک ہوتے ہیں۔ پروفیسر شو شین جب آخری بار اسرائیل گیا تو اسرائیل کی 'بار ایلان یونیورسٹی' نے یہودیت پر تحقیق میں اس کی غیر معمولی کاوشوں کے اعتراف میں اسے پی ایچ ڈی کی اعزازی ڈگری سے نوازا تھا۔ پروفیسر شو شین نے متعدد کتابیں اور مضامین لکھے ہیں جن میں چینی زبان میں لکھا گیا 'یہودی انسائیکلوپیڈیا' اور انگریزی زبان میں لکھی گئی کتاب 'کا یفنگ میں آباد چینی یہودیوں کی کہانیاں' شامل ہیں۔ مؤخر الذکر کتاب میں مصنف نے چین میں سب سے پہلے پہنچنے والے یہودیوں کے واقعات کو اکٹھا کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس کی نمایاں تحریرات میں 'شنگھائی میں یہودی' اور 'سامی نسل سے عداوت...... کیوں اور کیسے؟' بھی شامل ہیں۔ یہ دونوں کتابیں بھی اس نے چینی زبان میں تحریر کی ہیں۔

نیز اپریل ۲۰۰۰ء میں ایک اور اہم یہودی تحقیقاتی مرکز کا افتتاح ہوا۔ اس مرکز کا افتتاح 'ہیلونگ ژیانگ اکادمی برائے معاشرتی علوم' کے تحت کیا گیا اور مرکز کو 'ہار بین ادارہ برائے یہودی علوم' کا نام دیا گیا۔ افتتاحیہ تقریب میں ہار بین میں بسنے والے ستر یہودی بھی موجود تھے۔ اس مرکز نے 'ہار بین میں یہود' کے عنوان سے ایک البم بھی جاری کیا ہے جس میں ہار بین میں بسنے والے یہودیوں کے طرزِ زندگی کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ اس البم کا مقدمہ اسرائیل ابشاتین نے لکھا ہے، جس میں درج ہے کہ:

"ہار بین کے یہودیوں کے نام......

جن کے چینی وطن کی یادیں تا ابد باقی رہیں گی"!

چین میں یہود کی مذہبی سرگرمیاں

۲۰۰۴ء میں یہودیوں نے ہارپین میں اپنی دو عبادت گاہیں کھولیں۔ یہودی حاخام (مذہبی پیشوا) نے شنگھائی کے دورے کے موقع پر چینی حکومت سے مطالبہ کیا کہ یہودیت کو چین میں ایک مذہب کے طور پر سرکاری سطح پہ تسلیم کیا جائے۔ اس کا یہ مطالبہ چینی حکومت کے بعض ذرائع کے جانب سے جاری ہونے والی ان خبروں کے ردِ عمل میں آیا تھا کہ یہ عبادت گاہیں صرف یہودی سیاحوں کو ہارپین لانے کے لیے استعمال ہوں گی، نہ کہ عبادت کے لیے، کیونکہ یہودیت کو چین میں سرکاری سطح پر بطورِ مذہب تسلیم نہیں کیا جاتا۔ حاخام شلومو نے ان خبروں کو مسترد کرتے ہوئے کہا کہ: وہ حکومت سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ ان عبادت گاہوں کے اصل مقصد کا اعتراف کیا جائے جس کی خاطر یہ قائم کی گئی تھیں (یعنی یہودی طریقے کے مطابق عبادت اور یہودی مذہب کا فروغ)۔

یہاں ایک اہم بات کی طرف توجہ دلانا باقی ہے جو چین میں موجود عیسائیوں سے متعلق ہے۔ عیسائی مذہب پہلی بار آٹھویں صدی عیسوی میں چین آیا، پھر یہ بتدریج پھیلا اور دو لہروں میں اس مذہب کی اشاعت ہوئی، یہاں تک کہ یہ مذہب شنگھائی اور بیجنگ جیسے بڑے شہروں میں بھی عام ہو گیا۔ آج چین میں تقریبا ۴۰ لاکھ عیسائی ہیں جن کی اکثریت یہود نواز پروٹیسٹنٹ فرقے سے تعلق رکھتی ہے۔ پروٹیسٹنٹ فرقے کی اتنی بڑی تعداد کی چین میں موجودگی خود بخود یہود کے لیے اپنی سرگرمیاں بڑھانے کا کام آسان کر دیتی ہے۔

اختتامیہ

یہ بات تو یقینی ہے کہ چین میں یہودی سرگرمیوں میں اب کئی گنا اضافہ دیکھنے میں آئے گا کیونکہ آنے والے سالوں میں چین اور اسرائیل کے تعلقات میں مزید وسعت آنے کی توقع ہے۔ خصوصاً اب جبکہ امریکہ روبہ زوال ہے اور مغربی معیشت اپنی تاریخ کے بدترین بحران سے دوچار ہے تو اسرائیل کو بھی چین کی پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت ہے۔ کئی دہائیوں کی جہدِ مسلسل اور قربانی و مزاحمت کی ایک تاریخ رقم کرنے کے بعد امتِ مسلمہ اور بالخصوص اس کے مجاہد بیٹے آج اپنے ربِ کریم سے یہ امید لگائے بیٹھے ہیں کہ وہ جلد امریکہ کو شکست و بربادی سے دوچار کرے گا۔ ان شاء اللہ امریکہ کی شکست وریخت کے بعد یہودیوں

پر سے امریکی حمایت کا سایہ ہٹ جائے گا۔ اس عمل کا منطقی اختتام اسرائیل کے کمزور ہونے، یہودیوں کی عالمی سطح پر گرفت ٹوٹنے اور نتیجتاً اسرائیل کے زوال پر ہونا ہے۔ ایسے میں یہود کے پاس یہی واحد راستہ باقی بچتا ہے کہ وہ اپنی قوت وسطی ایشیا اور چین منتقل کرنے میں کامیاب ہو جائیں اور امریکہ کے زوال کے بعد چین کی پشت پناہی میں اپنے مکر و فریب اور اسلام دشمنی کا سلسلہ جاری رکھیں۔ یقیناچین سمیت کسی کی اوٹ میں بھی چھپ بیٹھنا اسرائیل کو ابدی امن فراہم نہیں کر سکتا، کیونکہ ہمارے نبیء صادق ومصدوق علیہ الصلاۃ والتسلیم ہمیں اس دن کی خبر پہلے ہی دے گئے ہیں جب غرقد کے درخت کے علاوہ ہر پتھر و درخت بول اٹھے گا کہ "اے مسلم! اے اللہ کے بندے! میری اوٹ میں یہ یہودی چھپا بیٹھا ہے، آؤ اور اسے قتل کرو"! لیکن اس دن کے آنے سے قبل ہم پر اپنی تیاری جاری رکھنا اور یہود اور اپنے درمیان حائل ہر رکاوٹ کو ہٹاتے چلے جانا لازم ہے! نیز ہمیں اس امر سے بھی ہوشیار رہنا ضروری ہے کہ اگر ہمارے مشرق کی سمت اسرائیل کا قدیم حلیف بھارت ہے تو ہمارے شمال میں بھی چین کی صورت میں یہود کا ایک مضبوط پشت پناہ موجود ہے۔ یقیناً سروں پہ منڈلاتے ان خطرات کو دیکھ کر آنکھیں بند کر لینا یا ان سے غافل رہنا کوئی دانش مندی نہ ہو گی!

امام ابنِ تیمیہ رحمہ اللہ روافض کی اہلِ سنت کے ساتھ خیانتوں اور ان کے پس پردہ عقائد کا گہرا علم رکھتے تھے، بالخصوص تاتاریوں کی یلغار کے دوران روافض کے اسلام دشمن کردار کے وہ عینی شاہد تھے۔ آپ نے مستقبل میں روافض کے کردار کی پیشین گوئی درج ذیل الفاظ میں کی:

"مستقبل میں جب بھی یہود عراق پر تسلط کی کوشش کریں گے تو روافض ان کے سب سے بڑے معاون ثابت ہوں گے، کیونکہ یہ ہمیشہ کفار و مشرکین اور یہود و نصاریٰ کے ساتھی رہے ہیں، ان کے ساتھ مل کر مسلمانوں سے لڑتے رہے ہیں اور انہوں نے ہمیشہ مسلمانوں سے عداوت رکھی ہے" [1]۔

ایرانی انقلاب، 'عالمگیر رافضی حکومت' کے قیام کی کوششوں کا نقطۂ آغاز

۱۹۷۹ء میں "لا شرقیہ لا غربیہ اسلامیہ اسلامیہ"، "ثورہ اسلامیہ لا شیعیہ ولا سنّیہ" اور "مرگ بر امریکہ" جیسے خوشنما نعروں کے تحت وجود میں آنے والے خمینی انقلاب نے شروع دن ہی سے مسلمانوں کی کثیر تعداد کو دھوکے میں مبتلا رکھا۔ نعروں کی حد تک یہ باور کرانے کی پوری کوشش کی گئی کہ یہ انقلاب عالمِ اسلام کا نمائندہ انقلاب ہے جس میں شیعہ تعصب کو ذرا بھی دخل نہیں۔ دوسری طرف دہائیوں سے استعماری قوتوں کے مظالم برداشت کرتے مسلمانوں کی ایک معتد بہ تعداد نے روافض کی تاریخ اور عقائد سے صرفِ نظر کرتے ہوئے محض امریکہ و اسرائیل کی دشمنی کے زبانی دعووں کو ہی اسلام سے لگاؤ کا کافی

[1] منہاج السنۃ؛ ۳/۳۷۸

ثبوت سمجھ لیا۔ مختلف اسلامی ممالک میں اس انقلاب کی خوشی میں عوام رافضیوں کے شانہ بشانہ سڑکوں پر نقل آئے۔ اہلِ سنّت کے بہت سے ماہرین بھی اپنی خدمات 'اسلامی ریاست' کے لیے وقف کرنے ایران جا پہنچے۔

لیکن انقلاب کے فوری بعد ایران میں اہلِ سنّت کے خلاف ہونے والے مظالم اور خلیجی ممالک اور دیگر ہمسایہ خطوں میں برپا ہونے والی پر تشدد رافضی تحریکوں نے یہ ثابت کر دیا کہ ایران میں موجود نظام نہ تو اسلام کا نمائندہ ہے اور نہ ہی اس کا مقصد اللہ کے کلمے کو سر بلند کرنا ہے، بلکہ یہ نظام تو اس لیے وجود میں آیا ہے کہ روافض کے کلمے (یعنی بدعت و شرک اور رافضیت و فارسی تعصب کے مکروہ مرکب) کو فروغ ملے اور وہ مجوسی ریاست جو حضرت عمرِ فاروق رضی اللہ عنہ کے سنہری دور میں اسلام کے ہاتھوں نابود ہوئی تھی ایک نئی شکل میں پھر سے ابھر پڑے، بالکل اسی طرح جیسے رافضی صفوی خاندان کے دور میں ہوا تھا۔ ایرانی انقلاب کا مقصد یومِ اول سے ہی یہ تھا کہ شیعیت کو ایران میں مضبوط کرنے کے بعد پہلے ہمسایہ ممالک اور پھر پورے عالم اسلامی میں برآمد کیا جائے اور اہلِ سنت کو ہر ممکن ذریعے سے مغلوب کیا جائے۔ فروری ۱۹۸۰ء میں ایرانی انقلاب کی پہلی سالگرہ پر یہ نعرہ لگایا گیا کہ ایران کعبہ کو کفار کی قید سے رہائی دلائے گا! اس موقع پر خمینی نے کہا:

''ہم دنیا بھر میں اپنی تحریک برآمد کرنے کے لیے کام کر رہے ہیں''[2]۔

انھی سیاسی مقاصد کے تحت خمینی کو 'ولایتِ فقیہ' کا نظریہ گھڑنا پڑا جس کو ایران اور خارج از ایران کے روافض میں خوب مقبولیت ملی۔ اس نظریے کو تسلیم کرتے ہوئے رافضیوں نے دعویٰ کر دیا کہ خمینی پوری امت کے لیے 'امام المسلمین' ہے۔ ولایتِ فقیہ کے نظریے نے خمینی اقتدار کو ایک 'شرعی' سندِ جواز اور خود خمینی کو روافض کے یہاں ایک خصوصی روحانی مقام دیا۔ روافض کے اسی عقد و وفاداری کی وجہ سے خمینی انقلاب جڑیں پکڑنے میں کامیاب رہا۔ درحقیقت اس انقلاب نے پوری دنیا میں رافضی فکر اور اس کے پیروؤں کو ایک ایسی پشت پناہ ریاست فراہم کر دی جو دنیا بھر میں ان کے مفادات کی نگہداشت کر رہی ہے۔

جہاں تک شیعوں کے 'وحدتِ مسلمین' کے خوشنما دعووں کا تعلق ہے تو ایران کی سنّی آبادی ہی اس

---

[2] تصدیر الثورۃ کمایراہا الامام الخمینی؛ ص ۳۹

کے خلاف سب سے بڑی دلیل ہے۔ انقلاب کے فوری بعد ایران میں اہلِ سنت کی تمام تنظیموں پر پابندی لگا دی گئی، بے شمار سنی علماء کو سابقہ شاہی نظام کا وفادار قرار دے کر شہید کر دیا گیا، سینکڑوں مساجد و مدارس مسمار کیے گئے، سنّی اکثریت کے علاقوں، ایرانی بلوچستان، کردستان وغیرہ میں مسلمانوں کا قتلِ عام کیا گیا اور شیعوں کی آبادکاری کی مہم چلا کر ان علاقوں میں سنّی قوت کو دبانے کی بھرپور کوشش کی گئی۔ آج صورتحال یہ ہے کہ تہران میں پانچ لاکھ سنی ہیں لیکن ان کی ایک بھی مسجد نہیں حالانکہ وہاں کلیسا، مندر اور آتش کدے موجود ہیں۔ ایران کے سنی طبقات آج ان بنیادی حقوق سے بھی محروم ہیں جو مسلمانوں کے تحت رہنے والے ذمی کافروں کو دیئے جاتے ہیں۔ پس 'شیعہ سنی اتحاد' اور 'وحدتِ مسلمین' کے رافضی نعرے بھی اپنے مکروہ عزائم اور ظالمانہ جرائم کو چھپانے کے لیے کیے جانے والے تقیہ، دھوکے وفریب ہی کا ایک جزو ہیں۔

ایرانی انقلاب کے بعد پر تشدد رافضی تحریکیں

خمینی کے رافضی انقلاب کو دیگر ہمسایہ ممالک تک منتقل کرنے کے لیے بھی ایران نے فوری طور پر سعی شروع کر دی اور جلد ہی متعدد مسلم ممالک میں پر تشدد رافضی تحریکیں کھڑی ہو گئیں۔

سعودی عرب میں رافضی تحریک

حجاز میں ایرانی انقلاب کے سال ہی روافض نے عاشورہ کے موقع پر مشرقی سعودیہ میں خمینی کی امامت کے تلے ایک شیعہ مملکت کے قیام کا مطالبہ کر دیا۔ اس مطالبے کے ساتھ ہی 'قطیف' میں شیعہ آبادی نے بغاوت کر دی جس کے دوران مظاہروں میں یہ نعرے لگائے گئے کہ ''ہم حسینی مذہب کے پیروکار ہیں، ہمارا قائد خمینی ہے''۔ بغاوت کو منظّم کرنے کے لیے حسن الصفار نامی رافضی کی قیادت میں ''منظمة الثورة الإسلامية لتحرير جزيرة العرب'' قائم کی گئی، یعنی ''جزیرۂ عرب کی آزادی کے لیے کوشاں اسلامی انقلاب کی تنظیم''! ۱۹۸۴ء میں مسجدِ حرام کے داخلی رستوں پر دو بم دھماکے ہوئے جن میں ایک شخص شہید اور کئی زخمی ہو گئے۔ اس حملے میں ملوث منصور حسن عبداللہ نامی شیعہ نے اعتراف کیا کہ اسے کویت میں خمینی کے وکیل باقر المہدی کی طرف سے ان دھماکوں کا حکم دیا گیا تھا۔ ۱۴۰۶ھ میں ایرانی حاجیوں سے ڈیڑھ سو کلو 'سی۔ فور (C4)' بارود پکڑا گیا جسے حج کے دوران بھیڑ والے مقامات پر حاجیوں کو

نشانہ بنانے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔ عرب انقلابات کے دوران سعودی ریاست کے مشرقی علاقوں میں ایک بار پھر رافضیوں نے اپنی علیحدگی پسند احتجاجی تحریک کو زندہ کیا ہے اور یہ تحریک تاحال ٹھنڈی نہیں ہوئی۔

لبنان، حرکتِ امل سے حزب اللہ تک!

ایران میں خمینی انقلاب کے وقت لبنان کی رافضی 'حرکتِ امل' اپنے شامی نصیری اور عیسائی حلیفوں کے ساتھ مل کر ہجرت کی زندگی گزارنے والے فلسطینی پناہ گزینوں اور لبنانی مسلمانوں کا خون بہانے میں مصروف تھی۔ ۲۰ مئی ۱۹۸۵ء کو صابرا اور شتیلا کے فلسطینی مہاجر کیمپوں میں بے گناہوں کے قتلِ عام اور ساتھ ہی لبنانی فوج کی (رافضیوں پر مشتمل) چھٹی بریگیڈ کی جانب سے برج براجنہ پر خونریزی کے بعد سنی علماء کا وفد شیخ اسعد بیوض التمیمیؒ کی سربراہی میں خمینی سے ملا تو اس نے یہ کارروائی رکوانے سے انکار کر دیا۔ رافضی حرکتِ امل کی وحشیانہ خونریزی کے بعد ایران کو یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ ایک نسبتاً صاف شہرت والی نئی تنظیم قائم کی جائے جو وسیع تر فارسی مملکت کے قیام اور خمینی کے طویل المیعاد ایجنڈے کی تکمیل کے لیے مفید ثابت ہو سکے۔ اسی مقصد کے پیشِ نظر ۱۹۸۲ء میں محمد حسین فضل اللہ (جسے لبنان کا خمینی کہا جاتا ہے) کے ذریعے 'حزب اللہ' نامی تنظیم کا قیام عمل میں لایا گیا۔ اس کے مقاصد میں واضح طور پر کہا گیا کہ: ''ہمارا مقصد ولایتِ فقیہ کے تصور پر قائم ایک اسلامی ریاست کا قیام ہے''۔ اس مقصد سے واضح ہو جاتا ہے کہ حزب اللہ ایران ہی کی ایک فوجی ملیشیا ہے جس کے قیام کا مقصد خمینی انقلاب کی دیگر ممالک تک توسیع کے علاوہ کچھ نہیں۔ اسی وجہ سے اس کے موجودہ جنرل سیکرٹری حسن نصر اللہ کو 'عالمِ عرب کا خمینی' کہا جاتا ہے۔ حزب اللہ کو عسکری تربیت بھی ایرانی 'پاسداران انقلاب'[3] نے دی۔ مارچ ۱۹۸۷ء میں حزب اللہ کے ترجمان ابراہیم الامین نے بیان دیا کہ: ہم یہ نہیں کہتے کہ ہم ایران کا حصہ ہیں، بلکہ ہم لبنان میں ایران ہیں اور لبنان خود بھی ایران میں ہے[4]۔ آج حزب اللہ نہ صرف لبنان میں ایک متوازی نظامِ حکومت کی حیثیت اختیار کر چکی ہے اور وہاں موجود سنی طبقات کے خلاف لرزہ خیز مظالم میں

---

[3] یعنی ایرانی کمانڈو دستے

[4] اخبار النھار؛ ۵ مارچ ۱۹۸۷ء

ملوث ہے، بلکہ اب تو وہ سرحد پار کر کے شام میں بھی بشار الاسد کی نصیری حکومت کو بچانے کے لیے علی الاعلان جنگ میں اتر آئی ہے۔ آج حزب اللہ کے ہزاروں تربیت یافتہ رضاکار بشار الاسد کی فوج کے ہمراہ شامی مسلمانوں کے لہو سے ہاتھ رنگنے میں مصروف ہیں۔

بحرین میں رافضی بغاوت

۳۰ اگست ۱۹۷۹ء کو ریڈیو تہران نے بحرین پر سید ہادی المدرسی، یعنی بحرین میں خمینی کے وکیل کی حکومت کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان کے بعد بحرین میں اثنا عشری شیعوں نے بڑے پیمانے پر بغاوت برپا کی۔ اس بغاوت کو منظّم کرنے کے لیے ہادی مدرسی کی قیادت میں "الجبهة الإسلامية لتحرير البحرين"، یعنی "بحرین کی آزادی کے لیے کوشاں اسلامی محاذ" نامی تنظیم قائم کی گئی اور اس کی مالی معاونت کے لیے 'الصندوق الحسيني الاجتماعي' کے نام سے ایک فنڈ بھی قائم کیا گیا۔ مدرسی اصلاً ایرانی تھا اور خمینی کی تحریک کو آگے بڑھانے کے لیے بحرین میں مقیم تھا۔ اس نے اپنی تقاریر و خطبات کے ذریعے ایران میں شیعہ سنی تنازعے کو نہایت سنگین بنا دیا۔ ۱۹۸۰ء میں رافضی عسکری تنظیم "حزب الله في البحرين" قائم ہوئی۔ ایران نے بتدریج بحرین میں سیاسی و عسکری لحاظ سے اس قدر رافضی قوت جمع کر لی ہے کہ وہ بحرین میں متعدد بغاوتیں کروا چکا ہے۔ عرب انقلابات کے بعد سے بحرین کی باغیانہ رافضی تحریک نے ایک بار پھر زور پکڑا ہے اور وہ ملک کا شاہی نظام الٹنے اور 'عوامی انقلاب' کا نعرہ بلند کر کے درحقیقت ایک خالص 'رافضی انقلاب' برپا کرنے کے لیے جدوجہد کر رہی ہے۔

کویت کی مسلح رافضی تحریک حزب الدعوۃ

کویت میں احمد عباس مہری نامی ایرانی رافضی نے ایرانی انقلاب کے بعد شیعہ مساجد کو انقلاب کی تائید و ترویج کے لیے استعمال کیا۔ یہ کویت میں خمینی کا نائب تھا اور اس کی طرف سے جمعہ کی نماز ادا کرواتا تھا۔ کویتی حکومت کو عسکری ضربوں کے ذریعے غیر فعال بنانے کے لیے محمد باقر حکیم کی قیادت میں 'حزب الدعوۃ' نامی جماعت قائم کی گئی جو ۸۶، ۱۹۸۵ء میں کویت اور سعودیہ میں بم دھماکوں اور ہائی جیک کرنے کے واقعات میں ملوث رہی۔

یمن کے متعصب حوثی شیعہ

ایرانی انقلاب کے موقع پر یمن کے شہر صعدہ میں وہاں کی شیعہ آبادی نے انقلاب کی تائید میں مظاہرے کیے۔ یمن میں شیعوں کی زیادہ تعداد زیدی فرقے سے تعلق رکھتی ہے جس کے عقائد باقی شیعہ فرقوں سے کافی مختلف اور اہلِ سنت کے قریب تر ہیں۔ تبھی اہلِ سنّت علماء انہیں اسلام سے خارج نہیں سمجھتے، بلکہ اس کے بر عکس زیدی اور اثنا عشری فرقے آپس میں ایک دوسرے کو کافر قرار دیتے ہیں۔ لیکن خمینی انقلاب نے یہاں پر بھی بہت تیزی سے اثنا عشری رافضی عقیدے کو فروغ دیا۔ اس مہم میں یمن کے حوثی قبیلے اور ایران اور عراق کے رافضی اساتذہ نے بھرپور کردار ادا کیا۔ ۱۹۸۲ء میں صلاح احمد فلیتہ نے ایرانی طرز کے رافضی انقلاب کی دعوت کو منظّم کیا۔ ۸۶ء میں بدر الدین حوثی کی قیادت میں 'شباب المومن' نامی تنظیم قائم کی گئی جو صعدہ اور دیگر شمالی یمن میں اہلِ سنّت کے خلاف قتل وغارت کا بازار گرم کرتی رہی ہے۔ حوثی قبیلے نے تیزی سے اثنا عشری عقائد قبول کیے ہیں اور ایران کی مدد سے اس کی عسکری قوت میں بھی مسلسل اضافہ ہوا ہے۔ اس وقت صورتِ حال ایسے مقام پر پہنچ چکی ہے کہ یمنی ریاستی قوت اور حکومت حوثی رافضیوں کے حملوں سے تباہ ہو چکی ہے، اور اللہ تعالیٰ کے فضل کے بعد اہلِ سنت کو حوثیوں کے مظالم سے بچانے کی اگر کوئی امید ہے تو وہ جزیرۂ عرب میں برپا جہادی تحریک ہی ہے۔

عراق کے رافضی ... 'جیشِ مہدی' سے حکومت پانے تک کا سفر

ایرانی انقلاب سے قبل خمینی عراق میں مقیم تھا اور بعد ازاں فرانس منتقل ہو گیا۔ خمینی نے عراق میں قیام کے دوران وہاں کی فارسی اور عرب شیعہ آبادی میں بھی اپنے نظریات کا پرچار کیا۔ پس اثنا عشری رافضی ریاست کے قیام کی تحریک ایران کے ساتھ ساتھ عراق میں بھی جاری رہی۔ ۱۹۷۷ء میں امام حسین رضی اللہ عنہ کے چالیسویں کے موقع پر جنوبی عراق میں مظاہرے اور جھڑپیں ہوئیں۔ اس موقع پر عراق کے رافضیوں نے 'آزاد عراق' کا مطالبہ کر دیا جس کا مقصد خمینی کے تحت عراق اور ایران کو متحد رافضی مملکت میں بدلنا تھا۔ عراق پر امریکی حملے کے موقع پر امریکہ اور عراق کے شیعوں میں قریبی تعاون رہا اور مقتدیٰ الصدر نامی رافضی قائد کی قیادت میں 'جیشِ مہدی' اور 'فیلق البدر' نامی عسکری تنظیمیں

بھی وجود میں آئیں جو عراقی مسلمانوں پر ظلم کے پہاڑ توڑتی رہیں۔ امریکی افواج کے عراق سے روانہ ہونے تک عراق مکمل طور پر شیعہ تسلط میں جا چکا تھا۔ آج سنی اکثریت والے عراق میں فوج، پولیس، استخبارات، اعلیٰ حکومتی عہدے، ملکی وسائل، تیل کی بیش بہا دولت...... غرض اس ملک کا سیاہ وسفید سبھی عراقی رافضیوں کے قبضے میں جا چکا ہے اور سنی ان کے تابع فرمان اور محکوم بن کر رہنے پر مجبور ہیں۔

پاکستان کی دہشت گرد رافضی تنظیمات

ایرانی انقلاب کے بعد پاکستان میں بھی متعدد متعصب و مسلح رافضی تنظیموں نے جنم لیا۔ تحریک نفاذِ فقہ جعفریہ، سپاہِ محمد، امامیہ سٹوڈنٹ آرگنائزیشن جیسی مختلف رافضی تنظیموں کا قیام دراصل وسیع تر رافضی فارسی ایجنڈے ہی کا حصہ تھا۔ ان تنظیموں کے ہاتھوں آج تک پاکستان کے نامور سنی علماء اور سنّی طبقے کی بااثر شخصیات کی ایک بڑی تعداد شہید ہو چکی ہے؛ اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ یہ بات بھی آج کسی سے مخفی نہیں کہ پاکستان میں میڈیا کے میدان پر بھی رافضی چھائے ہوئے ہیں اور ملکی سیاست میں بھی ان کا نفوذ تیزی سے بڑھ رہا ہے۔

شام کا حاکم، اسلام دشمن رافضی نصیری خاندان

خمینی انقلاب کے وقت عالمِ عرب کے دیگر ممالک جن میں مصر اور شام سر فہرست تھے، ان میں سنّی انقلابی تحریکیں کام کر رہی تھیں۔ ۱۹۷۹ء ہی میں شام کی 'اخوان المسلمین' کا وفد سعید حویٰ کی سربراہی میں خمینی سے ملنے آیا۔ یہ لوگ شام میں بعث پارٹی کی حکومت کے خلاف جدوجہد کر رہے تھے، جسے فرانس نو آبادیاتی دور کے اختتام پر شام کی ۹۰ فیصد سنی اکثریت والی آبادی پر حاکم بنا کر گیا تھا۔ ایرانی انقلاب کے وقت بعث پارٹی کی زمامِ اختیار حافظ الاسد نصیری رافضی کے ہاتھ میں تھی۔ بعث پارٹی کے ملحد اشتراکی عقائد اور حافظ الاسد کے نصیری ہونے کے باوجود خمینی نے اخوان کی حمایت سے انکار کر دیا[5]، حالانکہ اخوان نے خمینی انقلاب کا خیر مقدم کیا تھا۔ ایران نے محض اخوان کی حمایت سے انکار کرنے پہ اکتفا نہ کیا، بلکہ اس سے بھی آگے بڑھتے ہوئے حافظ الاسد کی کھلی حمایت کی اور ۱۹۸۲ء میں شام کے حماۃ شہر میں

---

[5] خمینی اثنا عشری شیعہ تھا، جو کہ نصیری شیعوں کو کافر قرار دیتے آئے ہیں، مگر اہلِ سنت کے خلاف یہ دونوں طبقات متحد ہو گئے۔

ہونے والے قتلِ عام میں شامی حکومت کا بھرپور ساتھ دیا۔ اس سانحے میں نصیری فوج ٹینک اور توپخانہ لے کر حماۃ شہر پر چڑھ دوڑی اور چالیس ہزار سے زائد اہلسنّت کو بلا تمیزِ عمر اور جنس شہید کر دیا۔ نیز جو سینکڑوں لوگ اس دوران گرفتار کیے گئے ان پر توڑے جانے والے وحشیانہ مظالم پر 'تدمر' اور 'صیدنا' کی جیلیں گواہ ہیں۔ اسی طرح عراق ایران جنگ کے دوران شام کی بعث پارٹی کی حکومت نے عراق کی بعثی حکومت کی بجائے ایران کی رافضی حکومت کی حمایت کی[6]، جس سے واضح ہو گیا کہ شامی حکومت کی اصل شناخت اس کی رافضی شناخت ہے، جبکہ اس کے سیکولر بعثی عقائد محض ایک ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔

عرب انقلابات کے بعد شام میں برپا ہونے والی عوامی بغاوت کے خلاف حافظ الاسد کے بیٹے بشار الاسد نے جو مظالم کیے، اس سے وہ اپنے بدبخت باپ کو بھی پیچھے چھوڑ گیا۔ اب تک اس جنگ میں ڈیڑھ لاکھ سے زائد شامی مسلمان شہید ہو چکے ہیں، بے شمار خواتین کی عصمت دریاں کی گئی ہیں، ہزاروں مرد و خواتین جیلوں میں بدترین مظالم کا سامنا کر رہے ہیں اور حد تو یہ کہ شامی حکومت نے اہلِ سنت کی آبادیوں کے خلاف مہلک کیمیائی ہتھیاروں کے استعمال سے بھی دریغ نہیں کیا جس سے ایک ایک رات میں ہزاروں شہادتیں واقع ہوئی ہیں۔ ایران اس سارے معاملے میں کھل کر شامی حکومت کا ساتھ دے رہا ہے اور لبنانی حزب اللہ بھی بشار کی فوجوں کے شانہ بشانہ اہلِ سنت کے خلاف جنگ میں شریک ہے۔

اسلامی خطوں میں رافضیت کی ترویج کا پچاس سالہ ایرانی منصوبہ

ایران نے انقلاب کی پہلی دہائی میں خلیجی و دیگر ہمسایہ ممالک میں پر تشدّد تحریکیں اور بغاوتیں برپا کر کے اپنے نظریے اور نفوذ کو وسعت دینے کی سر توڑ کوششیں کیں۔ لیکن ان تحریکوں کے خلاف سخت حکومتی ردعمل، عالمی طاقتوں کی طرف سے ایرانی انقلاب کی مخالفت، متعدد بڑے ممالک کی طرف سے ایران کے خلاف پابندیوں، عراق ایران جنگ اور دیگر کئی عوامل کی وجہ سے ایرانی صدر ہاشمی رفسنجانی اور رہبرِ اعلیٰ خامنائی کو رافضی انقلاب کو وسعت دینے کی حکمتِ عملی میں کچھ تبدیلیاں لانی پڑیں۔ اس نئ

---

[6] Abd Allah al-`Aqil, "Min a`lam al-da`wa wa-l-haraka al-islamiyya al-mu`asira" (Cairo: 2002), 453.)

پالیسی کو ۱۹۹۷ء میں تہران سے نشر کی گئی کتاب "تصدير الثورة كما يراه الإمام الخميني" سے سمجھا جاسکتا ہے۔ اس میں واضح کیا گیا کہ :

"انقلاب کو دیگر ممالک تک منتقل کرنے کا مطلب محض عسکری کارروائیاں اور ان ممالک کی فوجوں کے خلاف چڑھائی نہیں۔ بلکہ اس سے مراد دیگر نئے اسلوب ہیں جو جدید تقاضوں سے مطابقت رکھتے ہوں"۔

اس حکمتِ عملی سے مراد یہ تھا کہ جہاں جہاں اپنی عسکری قوت بحال رکھنا ممکن ہو وہاں اسے قائم رکھا جائے، مثلاً لبنان میں حزب اللہ، شام میں نصیری علوی فوج اور یمن میں مسلح رافضی حوثی قبائل۔ اس کے برخلاف دیگر ممالک مثلاً ترکی، عراق، افغانستان، پاکستان اور خلیج فارس کی ریاستیں (بحرین، عمان، کویت وغیرہ) میں سیاسی ہتھکنڈے استعمال کرتے ہوئے ریاستی نظام پر رافضی گرفت قائم کی جائے۔ نیز ان علاقوں میں بھی بقدرِ ضرورت عسکری قوت کے استعمال کو رد نہیں کیا گیا۔

اس مقصد کے حصول کے لیے ایران نے پچاس سالہ منصوبہ ترتیب دیا جو پانچ مراحل پر مشتمل ہے۔ اس منصوبہ کے مقدمہ میں لکھا گیا ہے کہ **ایرانی انقلاب کی دوسرے ممالک تک توسیع ایرانی سیاست کا مقصدِ اساسی ہے** اور اسی لیے یہ مفصل منصوبہ تیار کیا گیا ہے۔ گویا اس منصوبہ کا مقصد خمینی انقلاب کی سیاسی ذرائع سے ترویج و توسیع ہے۔ منصوبے کے مطابق اسلامی ممالک کو دو صفوں میں تقسیم کیا گیا۔ پہلی صف میں وہ ممالک شامل کیے گئے جن میں رافضی سرگرمیاں آسان ہیں مثلاً ترکی، عراق، افغانستان، پاکستان، بحرین وغیرہ اور دوسری صف میں وہ ممالک جن میں ایسی سرگرمیاں مشکل ہیں مثلاً بحرین کے علاوہ دیگر خلیجی ممالک، اردن، مصر وغیرہ۔ پھر اس منصوبے کو پانچ مراحل میں تقسیم کیا گیا۔

پہلا مرحلہ۔ بنیاد ڈالنے اور جڑوں کو مضبوط کرنے کا مرحلہ:

اس مرحلے میں متعلقہ ممالک میں شیعوں کی محفوظ آبادکاری کرنے پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے۔ پھر اگر وہ ممالک غریب ہوں تو ان میں تعلیمی اور ترقیاتی سرگرمیاں کرنے اور اگر وہ ممالک امیر ہوں (جیسا کہ سعودی عرب) تو انہیں افرادی قوت فراہم کرنے کے ذریعے وہاں نفوذ بڑھایا جاتا ہے۔ نیز ان ممالک کے صاحبِ مال اور صاحبِ اقتدار لوگوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کرنے، حساس اور اہم

مقامات پر شیعہ آبادیاں بنانے اور اقتصادی منصوبے جاری کرنے جیسے اقدام کے ذریعے اپنی جڑیں مضبوط کی جاتی ہیں۔ ان تمام اقدامات سے مقصود یہی ہوتا ہے کہ ان ممالک میں رافضی جتھے مضبوط ہوں۔

دوسرا مرحلہ۔ آغاز کا مرحلہ:

ابتدائی کام کر لینے کے بعد متعلقہ ممالک کے قوانین کے دائرہ کار میں رہتے ہوئے رافضی سر گرمیوں کا آغاز کرنے اور ان کے لیے باقاعدہ حکومتی اجازت حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ نیز حکومتی اور سکیورٹی اداروں میں اپنے افراد بھرتی کرانے، شیعہ آبادی کے لیے مقامی شہریت حاصل کرنے اور سنّی علماء اور حکومت کے درمیان چپقلش پیدا کرنے جیسے اقدامات پر خاص توجہ دی جاتی ہے۔

تیسرا مرحلہ۔ پرواز کا مرحلہ:

اس کے بعد تیسرے مرحلے میں حکومتوں کے ساتھ تعلقات کی مضبوطی اور حکومتی اور عسکری اداروں میں مزید نفوذ پذیری کی سعی کی جاتی ہے اور اس میں اس امر کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ ملازمت اختیار کرنے والے رافضی مذہبی سر گرمیاں انجام نہ دیں اور اپنا مذہبی رجحان مخفی رکھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ مزید اقتصادی منصوبوں کے اجراء کے ذریعے اقتصادی اثر و رسوخ میں اضافے اور اہلِ سنت کو ایران میں کاروبار کے مواقع فراہم کرتے ہوئے سنی سرمائے کی ایران کی جانب منتقلی پر بھی توجہ مرکوز کی جاتی ہے تاکہ روافض کا جو مال سنی آبادی میں لگ رہا ہے وہ واپس بھی آنا شروع ہو جائے اور بتدریج سنی ممالک کی معیشت پر ایرانی تسلط بھی قائم ہو سکے۔

چوتھا مرحلہ۔ پھل توڑنے کا مرحلہ:

چوتھے مرحلے میں اپنی کوششوں کو آگے بڑھاتے ہوئے ان ممالک میں انتشار کی کیفیت پیدا کرنے کی طرف کام تیز کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ایک طرف تو اہم اقتصادی مفادات کے حصول پر حکومت اور عوام کے درمیان پھوٹ ڈلوائی جاتی ہے تاکہ عوام حکمرانوں سے برگشتہ ہوں [7]، دوسری جانب سنی علماء سے قربت

[7] جس قسم کے حکمران اہلِ سنت کی گردنوں پر مسلط ہیں ان سے برگشتہ بلکہ باغی ہونا تو عین مطلوب ہے اور ان کی جگہ اہلِ دین سنیوں کو اقتدار میں لانا واجب ہے، لیکن روافض یہ کام اپنے حق میں کروانا چاہتے ہیں اور اپنے منصوبے کے مطابق اس کام کی کوشش میں مصروف ہیں۔ انھیں یہ ہر گز گوارا نہیں کہ ایسی کوئی تحریک اہلِ دین سنیوں کے ہاتھوں قائم ہو جائے اور پھر کامیاب ہو جائے۔ ایسی

پیدا کر کے انہیں عوام کی حمایت میں کھڑا ہونے سے روکنے کی کوشش کی جاتی ہے، تیسری جانب حکام کو علماء اور عوام کے خلاف اکسایا جاتا ہے اور چوتھی جانب عوام کو بھی تشدد پر ابھارا جاتا ہے ...... تاکہ ملک مکمل رسہ کشی اور انتشار کی سمت جائے۔ نیز اپنے اقتصادی اثر و رسوخ کو بھی استعمال کرتے ہوئے ملک کے حالات بگاڑنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ پھر ایسے مواقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ کوشش کی جاتی ہے کہ حکومت کی جانب لگاؤ اور اس سے وفاداری کا اظہار کر کے اہم سرکاری مناصب تک رسائی حاصل کی جائے۔ نیز اہم جگہوں پر زمینیں خریدنے سمیت بحیثیتِ مجموعی اپنی اقتصادی گرفت کو مضبوط تر بنانے کا موقع بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا جاتا۔

پانچواں مرحلہ۔ پختگی کا مرحلہ:

اس مرحلہ پر پہنچ کر توقع کی جاتی ہے کہ جس ملک کو اس منصوبے کا ہدف بنایا گیا تھا، اس میں بدامنی، معیشت کی بدحالی اور انتشار کی کیفیت ہو گی اور حکومت شدید ہچکولے کھا رہی ہو گی۔ ایسے موقع پر ملک کو اس صورتِ حال سے نکالنے کے لیے نمایاں رافضی شخصیات ایک 'عوامی کونسل' کی تشکیل کی تجویز دیں گی جو حکومت کو ملک قابو کرنے میں مدد دے گی۔ اس کونسل کی غالب اکثریت روافض پر مشتمل ہو گی۔ اس طریقہ سے روافض کو بلا خون خرابا اقتدار حاصل ہو جائے گا۔ لیکن اگر محض ان طریقوں سے منزل تک پہنچنا ممکن نظر نہ آئے تو پھر منصوبہ اس کی اجازت بھی دیتا ہے کہ پر تشدد عوامی تحریک کے ذریعے نظام کو الٹا جائے۔[8]

پچاس سالہ رافضی منصوبے پر عمل کی ایک نمایاں مثال: پاکستان

اس منصوبے پر کس تیزی کے ساتھ عمل ہو رہا ہے اس کے لیے پاکستان کی مثال ہی کافی ہے۔ ملک کے سرکاری دفاتر میں باقاعدہ رافضی جتھے موجود ہیں جو روافض کی بھرتی کو یقینی بناتے ہیں اور اس کے مقابلے میں اہلِ سنّت کو دبانے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے۔ بالخصوص پولیس، فوج، خفیہ ایجنسیوں اور

صورت میں ان کے پاس مقابلے میں عسکری تحریک کھڑی کرنے کی حکمتِ عملی موجود ہے جسے وہ آخری حربے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

[8] الحوثیہ فی الیمن: الأطماع المذهبية فی ظل التحولات الدولية؛ ص ۱۰۹

ایٹمی توانائی کے اداروں میں تو گزشتہ چند سالوں سے رافضی نفوذ میں نہایت تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔ صاحبانِ اقتدار وار بابِ سیاست میں رافضی اثر و رسوخ عروج پر ہے۔ ملک کا سابق صدر آصف زرداری ایران کا چہیتا اور متعصب رافضی ہے، سالوں نواز شریف کے دائیں بائیں ہاتھوں کا کام دینے والے دو وفاقی وزراء: عابدہ حسین اور مشاہد حسین بھی رافضی ہیں، سابق وزیرِ داخلہ فیصل صالح حیات رافضی ہے، فضائیہ کا سابق چیف مصحف علی میر رافضی تھا، حیدر علی رضوی سمیت ایم کیو ایم کی رابطہ کمیٹی کے متعدد اراکین رافضی ہیں، پیپلز پارٹی کی طرف سے رکن قومی اسمبلی اور متعدد اہم عہدوں پر فائز رہنے والا شخص فیصل رضا عابدی بھی متعصب رافضی ہے...... الغرض مثالوں کی کچھ کمی نہیں۔ اب تو صورتِ حال اس قدر دگرگوں ہو چکی ہے کہ پیپلز پارٹی اور ایم کیو ایم جیسی بڑی سیاسی جماعتیں بھی کھل کر ہر پلیٹ فارم پر اہلِ سنت کے بالمقابل روافض کی پشت پناہی کرتی ہیں، مگر انہیں پوچھنے والا کوئی نہیں!

میڈیا میں بھی رافضیوں کا اثر ورسوخ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔ ملک کے بیشتر بڑے ٹی وی چینلوں اور اخبارات کے کلیدی عہدوں پر روافض براجمان ہیں اور اپنے مذموم عقائد کی تشہیر اور اپنے سیاسی عزائم کی تکمیل کے لیے 'میڈیا کی آزادی' کا خوب استعمال کر رہے ہیں۔ میڈیا پر رافضی گرفت کا اندازہ لگانے کے لیے پاکستان فوج کے سابق ترجمان جنرل اطہر عباس نامی رافضی کے خاندان کی مثال لینا کافی ہو گا۔ اطہر عباس ملک کی فوج کی جانب سے میڈیا کو جاری ہونے والی تمام رپورٹوں، خبروں اور بیانات کا ذمہ دار تھا، اس کا ایک بھائی مظہر عباس 'اے آر وائی' چینل میں کلیدی عہدے پر فائز ہے اور 'پاکستان فیڈرل یونین آف جرنلسٹس' کا صدر رہا ہے، اس کا دوسرا بھائی اظہر عباس جیو چینل کا مینیجنگ ڈائریکٹر ہے اور اس کا تیسرا بھائی ظفر عباس بی بی سی ٹی وی کے ساتھ بھی کام کرتا رہا ہے اور ڈان اخبار کا مدیر ہے۔ یہ چاروں بھائی ملکی صحافت کی شہ رگوں پر قابض ہو کر نہایت سلیقے سے اپنے مقاصد کو آگے بڑھانے میں مصروف ہیں۔

اسی طرح ہر شہر میں تزویراتی اعتبار سے اہم مقامات پر امام بارگاہوں اور رافضی آبادیوں کی تعمیر بھی سب کے سامنے ہے۔ مثال کے طور پر دارالحکومت اسلام آباد کو دیکھ لیجیے۔ سوپر مارکیٹ، جناح سوپر مارکیٹ، بلیو ایریا مارکیٹ، آب پارہ مارکیٹ، سمیت شہر کے بیشتر مرکزی بازاروں میں نہایت مہنگی

زمینوں پر بڑی بڑی امام بارگاہیں موجود ہیں۔ اسی طرح شہر کے داخلے کے تقریباً تمام مرکزی راستوں کے قریب بھی کوئی نہ کوئی امام بارگاہ ضرور موجود ہے، خواہ آپ راولپنڈی سے آتے ہوئے آئی ٹین سیکٹر کے قریب سے داخل ہوں یا مری سے آتے ہوئے قائدِ اعظم یونیورسٹی کی سمت سے داخل ہوں یا موٹر وے سے آتے ہوئے گولڑہ موڑ کی طرف سے داخل ہوں، ہر اہم داخلے کے قریب ہی ایک امام بارگاہ موجود ہے۔ پھر شہر کے گرد شیعہ آبادی کی کثرت کی حامل کچی آبادیوں نے جو گھیراڈال رکھا ہے وہ اس کے علاوہ ہے۔ گویا عسکری نگاہ سے دیکھا جائے تو شہر کی شہ رگ اور تمام اہم شریانیں روافض کے قبضے میں ہیں۔ اس کی خطرناکی کو سمجھنے کے لیے اس پر غور کرلینا کافی ہو گا کہ محرم کے ایام میں روافض کی ایک محدود سی تعداد کیونکر اتنی سہولت سے شہر کی تمام اہم سڑکیں جام کر کے لاکھوں کی سنی آبادی کے معمولاتِ زندگی بالکل منجمد کر دیتی ہے اور شہر کو مفلوج کر کے رکھ دیتی ہے؟ یہ اسی وجہ سے ممکن ہو پاتا ہے کہ روافض پہلے ہی شہر کے ایسی اہم شاہراہوں اور بازاروں وغیرہ کے قریب بیٹھے ہیں کہ محض ایک مختصر سی غیر مسلح تعداد سے بھی وہ شہر کو بآسانی منجمد کر دیتے ہیں۔ پس اگر اسی اقلیت کے پاس کسی وقت اسلحہ آگیا (یا اس نے اپنا اسلحہ باہر نکال لیا) تو کیا ہو گا؟ اس کا اندازہ لگانا کچھ زیادہ مشکل نہیں۔

اس کے علاوہ پاکستان کے ہر شہر کے لیے ایک ایرانی نمائندہ نامزد ہے جو شہر میں بسنے والے روافض کی سرگرمیوں کی ایرانی ہدایات کے مطابق نگرانی کرتا ہے اور چنیدہ رافضی نوجوانوں کو تعلیم کے لیے ایران بھیجتا ہے جو اپنی واپسی تک ایرانی رافضی ایجنڈے سے پوری طرح ہم آہنگ ہو چکے ہوتے ہیں اور آتے ہی اہم مناصب پر تعینات ہو جاتے ہیں۔ یہی نہیں، بلکہ اب تو باقاعدہ عسکری تربیت کا اہتمام بھی جاری ہے اور سینکڑوں رافضی نوجوان کرم ایجنسی کے شیعہ علاقوں میں واقع عسکری تربیت گاہوں سے تفصیلی عسکری دورہ جات کر کے شہروں میں واپس آچکے ہیں اور نہ صرف مستقبل کی 'سنی کش' جنگ کے لیے تیاریاں کر رہے ہیں بلکہ حال میں بھی سنی علماء کے قتل کے واقعات میں ملوث ہیں۔

اختتامیہ

یہ تو رافضیوں کے کردار کی ایک مثال ذکر کی گئی، تاکہ ہمارے اردو دان قارئین اپنے گرد وپیش کا جائزہ لے کر ہماری بات کی سچائی کو جان جائیں۔ وگرنہ ابھی زمانہ بہت آگے نکل چکا ہے اور ایران کا کردار

عالمی منظر نامے میں خاصا واضح ہو چلا ہے۔ ایک طرف ایران نے اسرائیل کی مدد سے امریکہ سے بھی اپنے تعلقات بہتر کر لیے ہیں جبکہ روس سے تو پہلے بھی اس کا ساجھا تھا، دوسری طرف ہر اس خطے میں ایران نے براہِ راست جنگ میں شرکت شروع کر دی ہے جہاں عالمی طاقتیں اہلِ سنت کے خلاف بر سر پیکار ہیں، جس کی بڑی مثالیں عراق، یمن کے بعد اب شام میں سامنے آ رہی ہیں اور پوری دنیا یہ حقیقت جان چکی ہے۔ یہی وقت ہے کہ اہلِ سنت صلیبی صہیونی دشمنوں کے ساتھ ساتھ اس رافضی خطرے کو بھی اپنا دشمن باور کر لیں اور اس سے تحفظ کی تدبیر اختیار کریں۔ جہاں بغیر قتال کے دفاع ممکن ہو، وہاں بغیر قتال کے اپنا دفاع کریں اور دعوت کے ذریعے اس خطرے کو مسلم خطوں سے باہر کریں اور جہاں یہ رافضی خطرہ قتال پر اتر آئے تو تمام اہلِ سنت... فروعی اختلافات بھلا کر... اس کے مقابلے میں بنیانِ مرصوص بن جائیں اور ان کا منہ توڑ جواب دیں۔ سر دست اس مضمون میں ہم نے اس رافضی خطرے سے نمٹنے کا اجمالی لائحہ بیان کر دیا ہے، کسی دوسرے موقع پر اس لائحہ پر تفصیلی کلام کریں گے۔ ان شاء اللہ

زندگی میں کم ہی شخصیات ایسی ملیں جن کو تقوی، للّٰہیت، صفائے قلب، مومنانہ بصیرت، بلندئ اخلاق، نفاستِ طبع، زہد و قناعت، داعیانہ تڑپ، مجاہدانہ شجاعت اور علم دوستی میں شیخ مصطفی ابویزید رحمۃ اللہ علیہ جیسے بلند اور منفرد مقام پہ پایا۔ آپ کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا گویا آپ اس دورِ فتن اور اس عہدِ جدید سے کوئی تعلق نہیں رکھتے، بلکہ ہمارے درمیان چلتا پھرتا دورِ سلف کا ایک نمونہ ہیں۔

ایک امیر، استاد، مربی اور شفیق باپ!

عالمِ اسلامی کے علمی و ثقافتی مرکز مصر سے تعلق رکھنے والی اس محترم شخصیت سے راقم کا تعلق محض ایک امیر مامور کا رسمی تعلق نہ تھا، بلکہ آپ میرے لیے ایک استاد بھی تھے، مربی بھی اور روحانی باپ بھی! بالاصل ہر 'امیر' کا اپنے مامورین سے ایسا ہی تعلق ہونا مطلوب ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ اجتماعیت میں امیر کی حیثیت، 'سمع' اور 'طاعت' کے معنی اور احادیث میں ان دونوں کو الگ الگ بیان کیے جانے کی حکمت ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"فمقام الإمام ... في الهيئة الاجتماعية مقام النقطة من الدائرة، وعماله بمنزلة الدائرة نفسها، فآحاد الأمة يدورون حول هذه الدائرة، وهي تدور حول تلك النقطة، وبهذه الصورة تتكون من اجتماع الأفراد (الجماعة) ويصيرون كتلة واحدة وجسمًا واحدًا حيًّا، إذا اشتكى منه عضو تداعى له سائر الجسد.........

(السمع) وهو أن تستمع الأمة لأوامر الإمام، وتستهدي به؛ فكلمة (السمع) توضح أن مقام الإمام في الأمة مقام المعلم والمرشد؛ فعليها أن تتلقى أوامره بالقبول،

وتسترشد به في مهماتها".

"جماعت میں امام... کی حیثیت وہی ہے جو دائرے کے وسط میں نقطے کی حیثیت ہوتی ہے۔ پس امام وہ نقطہ ہے اور اس کے عُمّال وہ دائرہ۔ امت کے افراد اس دائرے کے گرد گھومتے ہیں اور دائرہ نقطے کے گرد۔ افراد کے اس مخصوص انداز سے جمع ہونے ہی سے 'جماعت' وجود میں آتی ہے اور ایک اکائی اور ایک زندہ جسم کی شکل لیتی ہے، ایسا جسم جس کے ایک حصے میں بخار ہو تو سارا جسم اس کی تکلیف کو محسوس کرتا ہے۔

......دوسری چیز جس کا حدیث میں حکم دیا گیا وہ ہے 'سمع' (بات سننا)، جس سے مراد یہ ہے کہ امت امام کے احکامات کو غور سے سنے اور ان سے رہنمائی حاصل کرے۔ 'سمع' کے لفظ سے واضح ہے کہ امام امت میں (محض ایک قانونی امیر کی نہیں بلکہ) معلم اور مرشد کی حیثیت (بھی) رکھتا ہے۔ اسی لیے امت پر لازم ہے کہ وہ اس کے احکامات کو اطاعت کے جذبے کے ساتھ سنے اور اپنے امور میں اس سے رہنمائی لے"۔ [1]

میں پورے اطمینان سے کہہ سکتا ہوں کہ شیخ سعید رحمۃ اللہ علیہ کو اپنے مامورین واتباع میں یہی مقام و مرتبہ حاصل تھا جو سطورِ بالا میں مذکور ہے۔

دل پہ اثر چھوڑنے والی پہلی ملاقات...

شیخ رحمۃ اللہ علیہ سے اولین ملاقات کی سعادت سن ۲۰۰۵ء کے اوائل میں شمالی وزیرستان کے علاقے میر علی میں حاصل ہوئی۔ میرے محترم استاد، شاعرِ جہاد، شہید احسن عزیز رحمۃ اللہ علیہ کی شیخ سعید رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات طے تھی اور وہ شفقت فرماتے ہوئے مجھے بھی ہمراہ لے گئے۔ شیخ کے ساتھ القاعدہ کے عسکری

---

[1] مجلة المنار، شعبان - 1340هـ، أبريل - 1922م، الخلافة الإسلامية، ألّفه باللغة الأُوردية أحد زعماء النهضة الهندية الشيخ أبو الكلام محيي الدين آزاد - صاحب مجلة (الهلال) الهندية، وترجمه بالعربية الشيخ عبد الرزاق المليح آبادي - محرر جريدة (بيغام) الهندية

مسؤول شیخ خالد حبیب رحمۃ اللہ علیہ اور کچھ دیگر قائدین بھی موجود تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب وزیرستان میں مجاہدین تاحال کمزور تھے اور فوج کا غلبہ و سطوت اب بھی بر قرار تھی۔ مجاہدین دن کو مراکز اور گھروں میں ہی بند رہتے اور رات کا اندھیرا پھیلنے کے بعد وہ اپنے کام نمٹانے اور ملاقاتیں کرنے کے لیے باہر نکل آتے۔ ہم بھی شیخ سے ملاقات کے لیے رات کو ہی نکلے اور رات ہی میں ملاقات مکمل کر کے اپنی قیام گاہ کی طرف واپسی ضروری تھی۔ چنانچہ ملاقات مختصر رہی اور بنیادی طور پر باہمی تعارف تک ہی محدود رہی۔ شیخ کی مسحور کن شخصیت نے اس ابتدائی ملاقات ہی میں دل میں گہری جگہ بنالی۔ آپ کی عمر اس وقت پچاس سال سے کچھ اوپر ہوگی، داڑھی پر لگی خضاب میں سے جابجا جھلکتے سفید بال آپ کی عمر کا پتا دے رہے تھے۔ آپ کے سر پر سفید عمامہ تھا جو آپ کی شخصیت کے ساتھ بہت جچتا تھا، آپ کے کاندھے پر 'کرن کوف' بندوق تھی اور آپ بہت صاف اور اجلے سفید لباس اور کالی واسکٹ میں ملبوس تھے۔ بعد میں آپ کے ساتھ وقت گزارنے کا زیادہ موقع ملا تو آپ کو ہمیشہ ہی بہت نفاست پسند پایا اور آپ کی سراپا زہد و استغناء طبیعت کے باوجود آپ کو ہمیشہ نہایت اجلے لباس میں ملبوس دیکھا۔ یہ اسلاف میں سے بہت سے بزرگوں کا طریقہ رہا ہے کہ وہ اپنے زہد و فقر کو کبھی اپنے ظاہر سے نہیں جھلکنے دیتے تھے اور ان پر قرآن کا یہ وصف صادق آتا تھا کہ ''يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ...'' [2](ان کی خودداری کی وجہ سے ان کے حال سے ناواقف شخص انہیں خوش حال سمجھتا ہے)! آپ کی پیشانی پر سجدوں کی کثرت وطوالت کے سبب واضح محراب بن چکی تھی، چہرے پہ مستقل ایک شفیق اور دھیمی مسکراہٹ بکھری رہتی تھی، بہت سکون اور اطمینان سے ٹھہر ٹھہر کر فصیح عربی میں گفتگو فرماتے تھے۔ مخاطب کی گفتگو بھی پورے دھیان اور توجہ کے ساتھ سنتے تھے اور اس کی بات نہیں کاٹتے تھے۔ کسی رائے سے اختلاف بھی کرنا ہو تو ایسی نرمی، حکمت اور شفقت سے کرتے تھے کہ محسوس ہی نہ ہوتا کہ اظہارِ اختلاف کر رہے ہیں اور لاشعوراً آپ کی بات دل میں اتر جاتی۔

آپ کے ساتھ یہ مختصر سی ملاقات تو نقطۂ آغاز تھا...... اس کے بعد آنے والے کئی سالوں کے دوران اللہ

[2] البقرۃ:۲۷۳

تعالیٰ نے آپ کو بہت قریب سے دیکھنے، سفر و حضر میں آپ کے ساتھ رہنے، مشکل حالات میں آپ کے ساتھ وقت گزارنے اور آپ سے بہت کچھ سیکھنے کا موقع دیا...... یقیناً آپ کے ساتھ گزرا وقت میری زندگی کے سب سے قیمتی لمحات میں سے تھا۔ مجھ جیسے ناکارہ کے لیے تو یہی سعادت بہت تھی کہ شیخِ محترم جیسے اولیاء اللہ اور قائدینِ ملت کے ایک مرتبہ دیدار کا موقع مل جائے، مگر رب کو اس سے زیادہ بھی کچھ منظور تھا اور اس نے اپنی رحمت سے ایسی بلند و بالا شخصیات اور عالی کردار کی حامل ہستیوں کے ساتھ طویل صحبت نصیب فرما دی۔ اس پر میں جتنے بھی سجدہ ہائے شکر بجالاؤں کم ہے۔

غلو سے پاک، دین کا اجلا فہم

شیخ سعید رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ تعلق کا آغاز ہوا تو آپ اس وقت محسنِ امت شیخ اسامہ رحمۃ اللہ علیہ اور قائدِ محترم شیخ ایمن الظواہری حفظہ اللہ کے بعد خراسان میں القاعدہ کے مرکزی ذمہ دار تھے۔ عملاً القاعدہ سے وابستہ تمام عسکری، دعوتی اور انتظامی امور کے فیصلے آپ ہی کی طرف لوٹتے تھے۔ پس آپ ہمارے لیے بھی ہمارے امیر کی حیثیت رکھتے تھے اور ہم اپنے بیشتر جہادی امور میں آپ ہی کی طرف رجوع کرتے تھے۔ آپ کے ساتھ ہماری پہلی مفصل نشست ۲۰۰۵ء میں ہوئی جب راقم کو اپنی عسکری تربیت کے بعد ایک ایسے مرکز میں رہنے کا اتفاق ہوا جہاں چند ساتھی تکفیر کے مسائل میں انتہائی غلو پر مبنی نظریات رکھتے تھے اور ان نظریات کی تشہیر و تبلیغ سے بھی باز نہیں آتے تھے۔ دینی جماعتیں ان کا خصوصی ہدف تھیں اور ان پر شتر بے مہار قسم کے فتاوی چسپاں کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ اس فضا سے احقر کو سخت کوفت اور پریشانی ہوئی اور یہ تہیہ کیا کہ یہ ساری صورتِ حال قائدین حضرات کے علم میں لائی جائے۔ پس اس سلسلے میں جناب احسن عزیز رحمۃ اللہ علیہ اور راقم نے شیخ سعید رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات کی اور ان کو مذکورہ بھائیوں کے رویے اور ان کے منحرف نظریات سے آگاہ کیا۔ شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے ان ساتھیوں کو طلب کر کے ان پر سخت برہمی کا اظہار کیا اور انہیں شیخ ابوالولید حفظہ اللہ اور دیگر اہلِ علم کے سامنے بٹھایا۔ ان میں سے ایک ساتھی ان علماء کی صحبت میں بیٹھ کر اپنے نظریات سے تائب ہو گیا جبکہ دوسرے نے اپنی آراء پر اصرار کیا تو شیخ نے

اسے تنظیم سے خارج کر کے اس کے وطن (عراق) واپس بھجوادیا۔

امت کے غم میں دھڑکتے پاکیزہ قلوب

اسی سے مشابہ ایک واقعہ اس کے کچھ عرصہ بعد بھی پیش آیا جب مجھے شیخ احسان اللہ مصری رحمۃ اللہ علیہ کے تحت محسود کے علاقے شکتوئی میں واقع معسکر میں تربیت کروانے پہ متعین کیا گیا۔ کچھ عرصہ بعد شیخ احسان اللہ کو کسی عذر کے سبب جانا پڑا اور ان کی جگہ ایک اور استاد نے سنبھالی۔ مذکورہ استاد نے بعض حکمتوں کی رعایت نہ کی، مقامی آبادی کے ساتھ کچھ اختلافی مسائل کو زیرِ بحث لائے اور مقامی علماء سے اس موضوع پر بحث مباحثہ کیا کہ محسود کے دور دراز دیہاتوں میں جمعہ کی جماعت کیوں نہیں ادا کی جاتی؟ علمائے احناف کے یہاں نمازِ جمعہ کے لیے کچھ شرائط ہیں جو ان دور دراز دیہاتوں میں پوری نہیں ہوتی تھیں، مگر مذکورہ استاد نے اس مختلف فیہ مسئلے کو موضوعِ نزاع بنایا اور نتیجتاً مقامی آبادی میں ایک ردعمل پیدا ہونا شروع ہو گیا۔ دونوں طرف سے دلائل و فتاوی لائے جانے لگے اور بحث کافی شدت اختیار کر گئی۔ مجھے جونہی شیخ سعید رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات کا موقع ملا میں نے ان کو اس تشویش ناک صورتِ حال سے مطلع کیا۔ اگرچہ میں میدانِ جہاد میں بالکل نووارد تھا اور مذکورہ استاد کئی سالوں سے اس میدان میں موجود تھے اور معسکر کے ذمہ دار بھی تھے مگر شیخ نے انھیں فی الفور معزول کیا اور ان کی جگہ ایک اور استاد کو مقرر کر دیا۔

ان دو واقعات نے راقم پر یہ بات واضح کر دی کہ القاعدہ کی مرکزی قیادت الحمد للہ دین کا ایک صاف ستھرا اور متوازن فہم رکھتی ہے، امت کی مصلحتوں اور اس مرحلے میں دین کے تقاضوں کو بخوبی جانتی ہے اور مسلکی تعصبات اور تنظیم پرستی کے جراثیم سے کوسوں دور ہے۔ تبھی اللہ تعالیٰ نے شیخ اسامہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے رفقاء پر امت کے قلوب کو اکٹھا فرمایا اور وطنی، لسانی، نسلی، مسلکی اور تنظیمی بنیادوں پہ منقسم امت کو از سرِ نو کتاب و سنت اور جہادِ کفار پر جمع کرنے کی عظیم خدمت ان کے ہاتھوں لی۔ میں اللہ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ میں نے ان بزرگوں خصوصاً شیخ سعید، شیخ ابو یحیی، شیخ عطیۃ اللہ، شیخ عبد اللہ سعید، شیخ ابو ولید، شیخ خالد حبیب، شیخ منصور شامی اور شیخ اسامہ کینی رحمہم اللہ وغیرہ کے ساتھ جتنا وقت گزارا...... میں نے ان

حضرات کو بلا تفریق تمام 'امت' سے محبت رکھنے اور تعصبات کی ہر نوع سے بالاتر ہونے میں تمام دیگر اہلِ دین طبقات سے بہت منفرد اور برتر پایا۔ ان کے قلوب و اذہان پر دینِ اسلام کا غم اور امت کی فکر کچھ ایسا سوار تھی کہ یہ دیگر فروعی اختلافات کو یکسر فراموش کر چکے تھے۔ ان کے ساتھ سالوں گزارنے، صبح و شام، سفر و حضر میں رہنے کے باوجود مجھے شاید کوئی ایک جملہ بھی ایسا سننے کو نہیں ملا جو مجھے میری فقہی ترجیحات بدلنے یا میری مسلکی وابستگی تبدیل کرنے کی طرف اشارتاً بھی دعوت دیتا ہو۔ کبھی میں نے خود سے کوئی علمی بحث چھیڑ دی تو انہوں نے بھی باوقار، علمی اور معتدل انداز میں اپنی رائے اور ترجیحات کا اظہار کر دیا مگر فریقِ مخالف پر طنز یا چوٹ کے کسی شائبے کے بھی بغیر۔ یقیناً سالہا سال تک اس اسلوب پر کاربند رہنا محض تکلف و تصنع سے ممکن نہیں، بلکہ یہ ان حضرات کی حقیقی قلبی کیفیات اور علمی و عملی ترجیحات کا عکاس تھا۔ یہ مجددِ جہاد شیخ عبد اللہ عزام شہید رحمۃ اللہ علیہ، محسنِ امت شیخ اسامہ بن لادن رحمۃ اللہ علیہ اور امیر المؤمنین ملا محمد عمر مجاہد رحمۃ اللہ علیہ جیسی غم خوارِ ملت شخصیات کی صحبتِ کیمیا کا اثر تھا جس نے ان حضرات کو امت کے غم میں جینے مرنے والا بنا دیا۔ یہ امت ہی ان کا خاندان تھا، یہی ان کی تنظیم اور بس اسلام ہی ان کا مسلک!

شیخ سعید رحمۃ اللہ علیہ بطور امیر

شیخ سعید رحمۃ اللہ علیہ کے حکم پر ہم ۲۰۰۶ء میں شمالی وزیرستان سے جنوبی وزیرستان کے علاقے وانا منتقل ہوئے اور آئندہ کئی سالوں تک وانا ہی ہماری بنیادی قیام گاہ اور بنیادی جہادی مرکز کا کام دیتا رہا۔ شیخ سعید رحمۃ اللہ علیہ ہر کچھ عرصہ بعد وانا کا چکر لگاتے اور جب بھی آتے ہم پہ خصوصی شفقت فرماتے، ہمارے مراکز میں وقت گزارتے، ہمیں تازہ احوال سے مطلع کرتے، دیگر محاذوں کی خبریں دیتے، ہم سے ہمارے کاموں کی کارگزاری سنتے، اس پر اپنے بصیرت افروز تبصروں اور قیمتی تجاویز سے نوازتے اور آئندہ کے لیے لائحہ عمل دے کر اپنی دیگر ملاقاتوں کے لیے روانہ ہو جاتے۔ آپ کی آمد ہر بار تازہ ہوا کا جھونکا ہوتی اور ہم سب میں ایک نیا ولولہ اور بجلیاں سی بھر دیتی۔

شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر بیعتِ جہاد

آپ سے تعلق دن بدن مضبوط تر ہوتا گیا یہاں تک کہ وہ فیصلہ کن موڑ آیا جب آپ نے ہمیں القاعدہ کی باقاعدہ بیعت کرنے کی دعوت دی۔ آپ ہی کے دستِ مبارک پہ، شیخ عطیۃ اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی موجودگی میں راقم نے محسنِ امت شیخ اسامہ رحمۃ اللہ علیہ کی اطاعت فی المعروف کی بیعت کی اور القاعدہ کے ساتھ جہادی سفر آگے بڑھانے کا عہد کیا۔ اللہ اس عہد کو وفا کرنے کی توفیق دے![3]

شیخ سعید رحمۃ اللہ علیہ اور جہادِ پاکستان

اس عرصے میں لال مسجد کا المناک سانحہ وقوع پذیر ہو چکا تھا۔ شیخ سعید رحمۃ اللہ علیہ کے سینے میں غم و غصے کا ایک الاؤ پک رہا تھا اور اس الاؤ کو شیخ اسامہ رحمۃ اللہ علیہ کی جانب سے جاری ہونے والے پر تاثیر اور شعلے برساتے بیان نے مزید مہمیز بخشی تھی۔ شیخ سعید رحمۃ اللہ علیہ اگرچہ نہایت حلیم الطبع، ملنسار، شفیق اور رحیم طبیعت کے مالک تھے اور سخت سے سخت اشتعال کے مواقع پر بھی کمال سکینت و وقار سے ضبطِ نفس کا مظاہرہ کرتے تھے، مگر معصوم پردہ دار بہنوں کو ایک دینی مدرسے میں اس بے دردی سے شہید کرنے کے واقعے نے آپ کو بھی جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس سانحے کے بعد سے آپ نے اپنی توجہات کا ایک بڑا حصہ اس ملک کے عوام پر مسلط طاغوتی نظام کو ڈھانے اور پاکستان میں نفاذِ شریعت کی جہد کے لیے وقف کر دیا۔ آپ نے اپنے سینے کا غم ہمارے سینوں میں بھی منتقل کیا اور ہمیں امریکہ اور اس کی صفِ اول کی حلیف فوج کے خلاف دعوت و قتال دونوں میدانوں میں بھرپور جدوجہد کرنے کا حکم دیا۔

۲۰۰۸ء کے وسط میں، راقم وانا سے محسود منتقل ہو گیا۔ محسود میں شیخ سعید رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقاتیں اور بھی زیادہ بڑھ گئیں۔ یہ وہ مرحلہ تھا جب فوج محسود سے نکل چکی تھی۔ پورا محسود قبیلہ امیر بیت اللہ محسود رحمۃ اللہ علیہ کی قیادت پر مجتمع تھا اور مجاہدین بے خوف و خطر محسود میں گھوما پھرا کرتے تھے۔ شیخ اکثر ہی راقم

---

[3] اور بالآخر استاد احمد فاروق رحمۃ اللہ علیہ اس عہد کو وفا کر چلے۔ نحسبہ کذلک (مدیر)

کے گھر آیا کرتے اور رات اکٹھے گزارتے۔ پاکستان کی جہادی تحریک کے مختلف پہلوؤں پر آپ سے تفصیلی نشستیں ہوتیں۔ ہم آپ کی آمد کے منتظر رہتے، آپ کے لیے سوالات کا ایک انبار جمع کرکے رکھتے۔ آپ بھی پدرانہ شفقت اور پورے تحمل کے ساتھ ہمارے سوالات سنتے اور اپنے مدلل جوابات کے ذریعے ہمارے ذہنوں کی الجھنیں دور کرتے، ہماری سوچ و فکر کو نکھارتے، فہم کو جلا بخشتے......!

شیخ رحمۃ اللہ علیہ بطور ایک مربی

ان نشستوں میں صرف جہادی امور ہی زیرِ بحث نہ آتے، بلکہ آپ ساتھ ساتھ غیر محسوس انداز میں تزکیہ و تربیت کیے جاتے۔ اکثر ہی آپ نماز کے بعد اخلاص، تعلق مع اللہ اور نماز کی حفاظت جیسے موضوعات پر بیان فرماتے تھے۔ جب موقع ملتا تو آپ میری تجوید کی غلطیاں ٹھیک کرواتے...... میری اذان، اقامت اور تلاوت سبھی کی غلطیاں آپ نے درست کروائیں۔ پھر اصل تربیت تو وہ تھی جو آپ کے عمل سے ملتی تھی! آپ کی نماز ...... سبحان اللہ! میں نے زندگی بھر آپ سے بہتر نماز پڑھنے والا نہیں دیکھا (نحسبہ کذلک)۔ آپ ذہن کو الجھا دینے والے مسائل اور اجتماعی معاملات پر گرما گرم بحثوں کے عین وسط میں ہوتے، مگر اذان سنتے ہی یوں اٹھ جاتے گویا آپ کا دل نماز ہی میں اٹکا ہوا تھا اور آپ کے کان اذان ہی کی آواز کے منتظر تھے...... پھر آپ اہتمام سے وضو فرماتے...... پھر نوافل ادا کرتے۔ آپ کتاب اللہ کے حافظ تھے اور بالاختصار ''الشیخ الحافظ'' کے نام سے بھی جانے جاتے تھے۔ آپ موجود ہوتے تو نماز کی امامت آپ ہی کرواتے... دل کو ٹھنڈک پہنچانے والے انداز میں تلاوت کرتے...... خوب ٹھہر ٹھہر کر، ایک ایک لفظ کا حق ادا کرتے...... یوں محسوس ہوتا گویا معانیٔ قرآن پر پورے تدبر و تفکر کے ساتھ خشوع میں ڈوبی تلاوت ہے...... رکوع، سجود، قیام، سبھی طویل ہوتے ...... آپ کی امامت میں پڑھی جانے والی ہر نماز یہ بلیغ درس دیتی کہ جن اللہ والوں کی نماز ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہو، وہ کیسی نماز ادا کرتے ہیں؟! میرا گمان ہے کہ آپ کے کاموں، فیصلوں اور وقت میں برکت کا راز آپ کا اہتمامِ نماز ہی تھا...... کیونکہ جس شخص کی نماز درست ہو جائے اس کی پوری زندگی کی عمارت قوی ستونوں پر درست انداز میں کھڑی ہو جاتی ہے۔

رات کا راہب...

پھر دن بھر کی نشستوں، بیانات، مجالس اور سفر کی تکان کے بعد آپ کی رات بھی مصلے پر گزرتی۔ مجھے نہیں یاد کہ میں نے آپ کے ساتھ کوئی رات ایسی گزاری ہو جب آپ تہجد پر بیدار نہ ہوئے ہوں۔ مصروفیات کے سبب آپ رات کو دو بجے بھی سوتے تو فجر سے کم از کم ایک گھنٹہ پہلے بیدار ہو کر نوافل ادا کرتے اور دعاؤں اور تلاوت میں وقت گزارتے۔ تہجد پر بھی ایسے عجیب دوام اور استمرار کے ساتھ عمل پیرا رہنے کی کوئی اور نظیر میری نگاہ سے نہیں گزری۔ غرض آپ کی گفتگو سے قبل خود آپ کا عمل آپ کے ساتھ رہنے والوں کی تربیت و تزکیے کا ایک مستقل سامان ہوتا اور آپ کی سیرت ''وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ''[4] کی جیتی جاگتی تصویر......!

بیت القرآن...

آپ کا اللہ کی کتاب سے تعلق بھی قابلِ رشک تھا...... جب اور جہاں فراغت کے لمحات ملتے، آپ مصحف کھول کر تلاوت میں مصروف ہو جاتے یا اپنے حافظے سے تلاوت کرنے لگتے۔ آپ نے اپنے پورے گھرانے کو ''بیت القرآن'' میں تبدیل کر دیا تھا اور آپ کے تمام بچے اور بچیاں بھی حفاظ تھے۔ آپ کے ایک قریبی ساتھی و رفیق نے مجھے بتایا کہ ایک بار ان کی اہلیہ کا ماہِ رمضان میں شیخ سعید رحمۃ اللہ علیہ کے گھر جانے کا اتفاق ہوا تو گھر میں قدم رکھتے ہی یوں محسوس ہوا کہ گویا شہد کی مکھیاں بھنبھنا رہی ہوں۔ ہر سمت سے تلاوت کی دھیمی دھیمی آواز اٹھ رہی تھی۔ کیا چھوٹے، کیا بڑے سب تلاوت میں مشغول تھے۔ شیخ سعید رحمۃ اللہ علیہ کی اہلیہ نے گفتگو کے دوران ان خاتون سے دریافت کیا کہ وہ ماہِ رمضان میں روزانہ قرآن کے کتنے پارے پڑھتی ہیں؟ انہوں نے کہا کہ: 'جب معمولات اچھے چلیں تو دو سے تین پارے'۔ یہ سن کر گھر کے چھوٹے بچوں تک سبھی کے چہروں پر بے اختیار حیرت و تعجب کے اثرات چھا گئے۔ ان خاتون نے

---

[4] البقرۃ:۱۶۵

پریشان ہو کر شیخ کی اہلیہ سے دریافت کیا کہ: 'کیا میں کچھ غلط کہہ گئی؟ یہ چہروں پر حیرت کیوں ہے؟' انھوں نے کہا کہ دراصل شیخ کے چھوٹے بچے بھی رمضان میں روزانہ دس پاروں سے کم تلاوت کا تصور نہیں کر سکتے...... شیخ نے ان کی ایسی ہی تربیت کی ہے......!

یہ کہانیاں سنتے سناتے ہوئے اکثر ہی یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہم پندرھویں صدی ہجری کی کسی شخصیت کا نہیں، بلکہ قرونِ اولیٰ کے کسی عابد و زاہد کا تذکرہ کر رہے ہیں۔ اللہ شیخ، ان کے شہداء بچوں اور شہید اہلیہ کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دیں اور ان کے پسماندگان کے ایمان و عمل میں برکت و ترقی دیں، آمین!

حقوق العباد کی ادائیگی کی فکر

شیخ کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے نہ صرف حقوق اللہ کے باب میں بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملتا تھا...... بلکہ حقوق العباد کے حوالے سے بھی آپ کی سیرت و عمل ایک مجسم درس تھا۔ آپ نہ تو غیبت کرتے اور نہ غیبت سننا برداشت کرتے۔ مومنین کی بابت آپ کا حسنِ ظن مبالغے کی حد تک بڑھا ہوا تھا۔ اگر کبھی ہم آپ کے سامنے کسی مصلحت کے تحت بھی کسی کا عیب یا کسی کے بارے میں منفی رائے ذکر کرتے تو آپ اس کو قبول کرنے میں شدید احتیاط برتتے...... خبر کی صداقت جانچنے کے لیے بہت جرح کرتے...... بات کسی سے سنی ہے یا خود مشاہدہ کیا ہے؟... جس سے سنی اس نے خود مشاہدہ کیا یا کسی اور سے سنی؟... جس نے مشاہدہ کیا اس نے بعینہ کن الفاظ میں بات کو بیان کیا؟... وہ بیان کرنے والا خود کس قدر قابلِ اعتماد ہے؟...... الغرض سوالات کا ایک ایسا طویل سلسلہ شروع ہو جاتا جو الٹا برائی یا عیب بیان کرنے والے کو دفاعی پوزیشن پر ڈال دیتا۔ آپ کی جانب سے مستقل اس رویے کے سبب آپ کے ساتھ رہنے والوں کو اس کی عادت ہو گئی کہ بلا تحقیق بات نہ کریں، سرسری سی تحقیق کو کافی نہ سمجھیں، مسلمان کے بارے میں حتی الامکان حسنِ ظن غالب رکھیں اور اس کی کمزوریوں کی اچھی توجیہ بیان کریں۔ آپ کے اس رویے سے ہمیں بالخصوص یہ سبق ملا کہ اجتماعی ذمہ داریوں پر فائز افراد اگر ایسا محتاط رویہ نہ رکھیں اور ہر منفی بات پر کان دھرنے لگیں تو نہ صرف اس سے ان کے اجتماعی فیصلے بری طرح متاثر ہوں گے بلکہ ان کے قلوب کی بھی وہ کیفیتِ پاکیزہ نہ رہ پائے جس کی تمنا

نبیءاکرم صلی اللہ علیہ وسلم کیا کرتے تھے:

”لَا يُبَلِّغُنِي أَحَدٌ مِنْ أَصْحَابِي عَنْ أَحَدٍ شَيْئًا فَإِنِّي أُحِبُّ أَنْ أَخْرُجَ إِلَيْكُمْ وَأَنَا سَلِيمُ الصَّدْرِ“۔

”میرے اصحاب میں سے کوئی بھی مجھے کسی دوسرے صحابی کے بارے میں منفی بات نہ پہنچائے کیونکہ میں یہ چاہتا ہوں کہ میں تمہارے پاس اس حال میں آیا کروں کہ میرا دل سب کے لیے صاف ہو“۔[5]

خونِ مسلم کی بابت بے مثل احتیاط

اسی طرح جہاں ایک طرف آپ کے سینے میں کفار کے خلاف غضب کا ایک آتش فشاں پھٹ رہا ہوتا تھا، وہیں خونِ مسلم کے بارے میں آپ شدید حساس تھے اور اس کی ہر ہر چھینٹ سے اپنا دامن بچانے کی سعی کرتے تھے۔ مسلم خطوں کے اندر کفار و مرتدین کے خلاف جنگ کے دوران اتفاقی و حادثاتی طور پہ خونِ مسلم بہنے کے امکانات بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ ایسے موقع پر اگر شیخ سعید رحمۃ اللہ علیہ جیسی احتیاط نہ ہو تو بہت خطرناک نتائج نکل سکتے ہیں۔ شیخ نے اس معاملے میں اپنے ساتھیوں کی عجیب عمدہ تربیت کی۔ کتنی ہی کارروائیوں کے منصوبے آپ نے مسلمانوں کو نقصان پہنچنے کے خدشے کے سبب منسوخ کر دیے۔ ایک ایسے وحشی دشمن کا مقابلہ کرتے ہوئے جو نہ مدارس کو بخشے، نہ مساجد کو، نہ عوامی بازاروں کی تباہی سے چوکے نہ عام بستیوں پر بمباریوں سے، نہ قیدیوں پر تشدد کر کے ان کی ہڈیاں توڑنے سے جھجکے نہ ان کی عصمتیں پامال کرتے ہوئے شرمائے...... ایسے بھیڑیا نما دشمن کے مقابلے کے دوران ضبطِ نفس کا مظاہرہ کرنا اور ہر قسم کی اشتعال انگیزی کے باوجود شرعی حدود کا پاس کرنا یقیناً ایک بہت کٹھن کام ہے...... مگر الحمدللہ شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے ہر ایسے موقع پہ ضبطِ نفس کا مظاہرہ کیا اور صریح حرام ہی نہیں بلکہ مشتبہ امور میں بھی کودنے سے ہمیشہ رکے رہے۔ شیخ اس معاملے میں اس قدر حساس تھے کہ کسی ہدف کی معلومات لینے کے لیے عموماً ایک

---

[5] سنن أبي داود، كتاب الأدب، باب في رفع الحديث من المجلس

ذریعے پر یا ایک دو ساتھیوں کی معلومات پر اعتماد نہ کرتے، بلکہ مختلف ساتھیوں کے ذریعے معلومات کی تصدیق کرواتے، دشمن کی سطح اور نوعیت معلوم کرواتے، وہاں مسلمانوں کی موجودگی کے امکانات کی خوب چھان پھٹک کرتے اور بارود اور اسلحے کی نوعیت و مقدار کا کڑا جائزہ لیتے تاکہ نقصان بس ہدف تک ہی محدود رہے۔ آپ مجھ سے کہا کرتے تھے کہ: ''اس زمانے میں محتاط رائے اور مبالغے سے پاک گواہی دینے والے افراد تھوڑے ہیں، بعض اوقات معلومات لانے والا بھائی کارروائی کروانے کے شوق و جذبے میں مبالغے پر مبنی معلومات دے دیتا ہے۔ اس لیے ایک سے زائد ذرائع سے معلومات کی تصدیق کیا کرو''۔ یہ آپ کے اسی محتاط رویے کا نتیجہ ہے کہ الحمدللہ گزشتہ سات سال میں القاعدہ سے وابستہ مجاہد ساتھیوں نے پاکستان میں کم ہی کوئی ایسی عسکری کارروائی کی ہو گی جو شرعاً قابلِ گرفت ہو۔ الحمدللہ ان کی تمام تر کارروائیوں کا مرکزی ہدف امریکہ اور اس کے یورپی اتحادیوں کے پاکستان میں موجود مفادات، نیز امریکہ کی آلہءکار پاکستانی فوج اور استخبارات کے مراکز اور ان کے اہلکار رہے ہیں۔

مسلمانوں کے مابین اتحاد کی دیوانی تڑپ

مسلمانوں کے مابین اتحاد پیدا کرنا شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے قلب میں موجزن ایک اساسی جذبہ و خواہش تھی۔ آپ نے وزیر و محسود قبائل کے مجاہدین کو قریب لانے، نیز انصار و مہاجرین کے رشتے کو مضبوط کرنے کے لیے سالوں ان تھک سعی کی۔ آپ کا بہت سا وقت اختلافات کو حل کرنے، تنازعات نمٹانے اور قلوب کو ایمانی محبت کے رشتے میں پرونے میں گزرتا۔ یہ آپ ہی کی سعی کا نتیجہ تھا کہ اللہ کی توفیق سے ''شوریٰ اتحاد المجاہدین'' کا قیام عمل میں آیا جس میں تحریکِ طالبان پاکستان کے امیر بیت اللہ محسود شہید رحمۃ اللہ علیہ، وزیر قوم کی دونوں بڑی شاخوں اتمان زئی اور احمد زئی کی جہادی قیادت اور داوڑ قوم کی جہادی قیادت ایک اتحاد میں اکٹھی ہو گئی اور اس سے بھی عجیب امر یہ کہ اس اتحاد کی شوریٰ نے بالاتفاق شیخ سعید رحمۃ اللہ علیہ کو اپنا امیر تسلیم کیا۔ جو کوئی بھی وزیر اور محسود قوم کی تاریخی چپقلش اور عرب و عجم کے مزاجوں اور ثقافتوں کے تفاوت سے واقف ہے وہ یقیناً اس کی بخوبی قدر کر سکے گا کہ اس اتحاد کا عمل میں آنا ایک معجزے سے کم نہ

تھا۔ اگرچہ یہ اتحاد ایک ڈیڑھ سال ہی قائم رہا اور بیت اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت اور اس کے بعد کے حالات میں اس کا جاری رہنا ممکن نہ ہو سکا، لیکن بلاشبہ یہ شیخ رحمۃ اللہ علیہ کا ایک تاریخی کارنامہ تھا اور اس اتحاد کا وجود میں آنا اس بات کا بین ثبوت ہے کہ اگر مخلص، حکیم اور بے لوث قیادت میسر ہو تو یہ امت تمام تر اختلافات پسِ پشت ڈال کر اس کی قیادت میں جمع ہو جاتی ہے۔ یقیناً آج بھی اس نوعیت کے اتحاد قائم کرنے اور سرزمینِ خراسان میں موجود مجاہدین کو کسی منظم انداز میں ترتیب دے کر امارتِ اسلامیہ افغانستان کے جھنڈے تلے جمع کرنے کی ضرورت شدت سے موجود ہے۔

قبائلی مجاہدین کے علاوہ آپ نے بندوبستی علاقوں سے تعلق رکھنے والے پاکستانی مجاہدین کے درمیان وحدت و قربت پیدا کرنے کا بیڑا بھی اٹھایا اور آپ کی مستقل کوششوں کے نتیجے میں تقریباً ۱۰ پاکستانی مجموعات کے ذمہ داران محسود کے علاقے مکین میں جمع ہوئے اور پاکستان کی جہادی تحریک کو ایک رخ دینے اور جہادی مجموعات کے مابین اشتراکِ عمل بڑھانے کی عملی صورتوں پر تفصیلی مشاورت ہوئی۔ یہ نشست غالباً ۲۰۰۹ کے اوائل میں ہوئی۔ پھر ۲۰۰۹ کے اواخر میں اسی نوعیت کی ایک اور نشست بھی ہوئی جس میں شیخ فاتح (عثمان الشھری) رحمۃ اللہ علیہ اور کچھ دیگر مشائخ بھی شریک ہوئے۔ نیز اس نوعیت کی تیسری نشست ۲۰۱۰ یا ۲۰۱۱ میں میران شاہ شمالی وزیرستان میں منعقد ہوئی۔ ان نشستوں نے پاکستانی مجموعات کے مابین قربت بڑھانے میں ایک اہم کردار ادا کیا اور سوچ و فکر میں یکسانیت و موافقت پیدا کرنے کی طرف کافی پیش رفت کا باعث بنیں۔ 'جماعت قاعدۃ الجہاد برصغیر' کا قیام بھی درحقیقت انہی مبارک کوششوں کا ثمرہ ہے۔

شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کے آخری دو تین سال اسی ایک نکاتی ایجنڈے کے گرد گھومے اور یہی آپ کی سعی کا بنیادی محور رہا کہ کسی طرح خراسان میں موجود تمام جہادی مجموعات میں وحدت پیدا کر دی جائے۔ آپ اس سوچ پر یکسو تھے کہ امارتِ اسلامیہ افغانستان ہی وہ پلیٹ فارم ہے جس کے تحت مجتمع ہونا شرعاً بھی مطلوب ہے اور عقلاً بھی لازم۔ لیکن عرب و عجم کی درجنوں قومیتوں اور بیسیوں ممالک سے تعلق رکھنے والے مجاہدین کو ایک لڑی میں پرو کر، ایک منظم شکل دے کر امارت کے جھنڈے تلے اکٹھا کرنا ایک اتنا

کٹھن اور پہاڑوں جیسا بھاری کام تھا کہ جس کا عزم کرنا اور جس کے لیے عملاً سعی کرنا شیخ جیسے صابر و حلیم اور مؤید من اللہ اور حکیم فرد ہی کے لیے ممکن تھا۔

پورا گھرانہ راہِ خدا میں قربان ہو گیا

آپ مجاہدین کے درمیان– بلا تفریقِ قومیت و تنظیمی پس منظر– ایک ایسی مقبولِ عام اور محبوبِ عوام شخصیت تھے جس کا سب یکساں احترام کرتے تھے اور جس کی بات رد کرنا سبھی کے لیے مشکل ہوتا تھا۔ آپ کا وجود مختلف پس منظروں سے تعلق رکھنے والے مجاہدین کے مابین ایک پل کی حیثیت رکھتا تھا۔ آپ کی موجودگی اس بات کی ضامن ہوتی تھی کہ کوئی اختلاف بھی معقول حدود سے آگے نہیں بڑھ سکے گا اور آپ پیچیدہ سے پیچیدہ مسئلے کو اپنی حکمت و خلوص سے سلجھا لیں گے۔ تبھی آپ کا وجود امریکہ اور اس کے حواریوں پہ اس قدر گراں گزرا کہ وہ آپ کو آپ کی اہلیہ اور بچیوں سمیت مارنے سے بھی نہیں چوکے اور موقع ملتے ہی آپ پر جاسوسی طیاروں نے میزائل داغ دیئے جس سے آپ، آپ کی ایک اہلیہ، آپ کی بچیاں، اور آپ کے انصار کے گھر کی متعدد خواتین شہید ہو گئیں...... تقبلهم الله في الشهداء۔ یہی نہیں بلکہ آپ کی شہادت کے بعد آپ کے دونوں بڑے بیٹوں کو بھی اس بدبخت دشمن نے جاسوسی طیاروں کے ذریعے چن چن کر نشانہ بنایا اور وہ بھی شہادت کے عالی رتبے پر فائز ہو گئے، ان شاء اللہ۔

شیخ سعید رحمۃ اللہ علیہ کی سیرت کے چند دیگر روشن پہلو

یہاں شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی سیرت کے بعض دیگر گوشوں پر روشنی ڈالنا بھی نفع سے خالی نہ ہو گا۔

عمدہ انتظامی صلاحیتیں

شیخ غیر معمولی انتظامی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ آپ نے اپنی عصری تعلیم کے دوران 'فنِ ادارت' (مینیجمنٹ سائنس) ہی میں تخصص کیا تھا۔ آپ طبعاً بھی بہت منظم و مرتب زندگی گزارنے کے عادی تھے اور اجتماعی امور کو بھی منظم انداز سے چلانا پسند کرتے تھے۔ آپ نے نہ صرف القاعدہ کے جہادی امور کو منظم کرنے کے لیے بہت سنجیدہ سعی کی، بلکہ قبائلی مجموعات کو بھی فنِ ادارت میں باقاعدہ دورے کروائے

اور کاموں کو منظم انداز میں چلانے کا ڈھنگ سکھایا۔ میں آپ کے ساتھ بعض ایسے دورہ جات میں شریک ہوا اور یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ آپ نے کس سہل و عام فہم انداز میں انتظام و انصرام سے متعلق اصول ایک عام قبائلی ذہن کو سمجھائے۔ آپ کی اس تربیت کے زیرِ اثر بعض ایسے قبائلی مجموعات بھی تیار ہوئے جنہوں نے روایتی قبائلی طرز کی جگہ آپ کے سکھلائے ہوئے انتظامی اصولوں کے مطابق خود کو منظم کیا اور کم وسائل کے باوجود بہتر کارکردگی اور اچھے نتائج دکھائے۔

علم دوستی

اس کے ساتھ ساتھ آپ شرعی علوم پر بھی مناسب دسترس رکھتے تھے۔ آپ کو شیخ اسامہ رحمۃ اللہ علیہ اور شیخ ایمن حفظہ اللہ سمیت بہت سے قائدین اور اہلِ علم و حکمت کی طویل صحبت ملی تھی جس دوران آپ نے ان سے خوب علمی استفادہ کیا تھا۔ تبھی شرعی معاملات میں بھی بیشتر مشائخ آپ کی رائے کو وزن دیتے تھے اور آپ سے رہنمائی لیا کرتے تھے۔ 'ادارہ السحاب' سے نشر ہونے والے آپ کے بیانات اور 'طلائع خراسان' رسالے میں چھپنے والی آپ کی تحریرات آپ کے علمی مقام کی کچھ جھلک دکھاتی ہیں۔ آپ کو امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ کی تحریرات سے خصوصی شغف تھا اور وہ کثرت سے آپ کے زیرِ مطالعہ رہتی تھیں۔ اس کے علاوہ آپ کے کمپیوٹر میں کتابوں کا ایک وسیع ذخیرہ موجود تھا جس سے آپ حسبِ فرصت استفادہ کرتے رہتے تھے۔ یہ بھی آپ کی علم دوستی ہی تھی کہ آپ مجھ جیسے ناکارہ کو مستقلاً تحریرات لکھنے اور بیانات دینے پر ابھارتے رہتے تھے اور میری ہر ناقص سی کاوش پر بہت حوصلہ افزائی فرماتے تھے۔ بالخصوص 'حطین' رسالے کو پابندی اور اہتمام سے نکالنے پر آپ بہت زور دیا کرتے تھے اور اس کی طباعت کے بعد آپ خود اس کو وزیرستان کے مختلف علماء اور جہادی قائدین میں تقسیم کیا کرتے تھے۔ آپ کی گاڑی میں حطین کے تازہ شمارے کے پندرہ بیس نسخے ہر دم موجود ہوتے تھے جو آپ موقع محل کی مناسبت سے تقسیم کرتے تھے۔

داعیانہ تڑپ

شیخ رحمۃ اللہ علیہ کے سینے میں ایک داعی کا دل دھڑکتا تھا۔ دعوت الی اللہ سے آپ کو گہرا شغف تھا۔ آپ پاکستان کے نمایاں مدارس میں موجود علماء اور دینی جماعتوں کے قائدین کے نام دعوتی خطوط لکھ کر اکثر ہمارے حوالے کیا کرتے تھے تاکہ ہم ان تک یہ خطوط پہنچائیں۔ خود قبائلی علاقہ جات کے اندر بھی آپ نیکی کی فضا عام کرنے، منکرات کو روکنے اور دعوتِ جہاد پھیلانے کے لیے سرگرم رہتے تھے۔ جہاں بیٹھتے وہاں کچھ نہ کچھ دعوت و تبلیغ کا کام ضرور کرتے۔ جس سے ملتے اس کو اس کے دینی امور کی بابت نصیحت کرتے، عبادات کے اہتمام پہ توجہ دلاتے اور جہاد سے مضبوط وابستگی پر ابھارتے۔ آپ دیگر تنظیمات کی جہادی قیادتوں کے ساتھ بھی بعض اوقات ایسی دعوتی و تربیتی نشستوں کا اہتمام کرتے جن میں دیگر اجتماعی امور اور جہادی کام قطعاً زیرِ بحث نہ لاتے بلکہ پوری توجہ دعوت و تربیت پر مرکوز رکھتے۔ مجھے ایسی دو نشستوں میں شرکت کا موقع ملا جن میں سے ایک شہید بیت اللہ محسود رحمۃ اللہ علیہ، ان کے دستِ راست مولانا ولی الرحمان شہید رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے کچھ دیگر قریبی رفقاء کے ساتھ ترتیب دی گئی۔ نشست تقریباً دو دن جاری رہی۔ القاعدہ کی طرف سے اس میں شیخ ابو یحیی، شیخ عطیۃ اللہ، شیخ خالد حبیب، ڈاکٹر سربلند زبیر رحمہم اللہ اور کچھ دیگر حضرات شریک ہوئے۔ ترجمانی کے فرائض احقر نے سرانجام دیے۔ جمہوریت اور مقاصدِ جہاد سمیت بہت سے علمی و مفید موضوعات زیرِ بحث آئے۔ شیخ نے محسود کے علاقے میں (جہاں مجاہدین کو بڑی حد تک مکمل شوکت حاصل تھی) منکرات کے خاتمے کے لیے ایک شعبہء امر بالمعروف و نہی عن المنکر تشکیل دینے پر خصوصی زور دیا۔ الحمد للہ شیخ کے بار بار تحریض دلانے پر بالآخر محسود میں فوجی آپریشن سے چند ماہ قبل بیت اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے یہ شعبہ خود تشکیل دیا، خطہء محسود کو مختلف حلقوں میں تقسیم کر کے ہر حلقے پر ایک عالمِ دین کو 'امر بالمعروف' کا ذمہ دار مقرر کیا اور ابتداء میں اپنے ہی مجاہدین کی دینی تربیت کی کمزوریوں کو دور کرنے، اہتمامِ صلاۃ کا عادی بنانے، بعض مروجہ منکرات کو ترک کرنے اور فیصلے شریعت ہی کے مطابق کروانے جیسے امور پر مضبوطی سے جمانے پر توجہ دی گئی۔ الحمد للہ یہ مبارک سلسلہ محسود پر فوج

کے ظالمانہ قبضے کے بعد بھی جاری رہا اور حلقہء محسود کے مجاہدین نے ہجرت و دربدری کی زندگی میں بھی اس شعبے کو ہمیشہ فعال رکھا اور یہ شعبہ تاحال بہت سے خیر کے کام میں مصروف ہے۔ اللہ نے چاہا تو یہ عمل شیخ سعید رحمۃ اللہ علیہ کے لیے ایک صدقہ جاریہ ثابت ہو گا۔

مقامی مجاہدین میں اصلاحی کوششیں

ایسی ہی ایک نشست شمالی وزیرستان کی جہادی قیادت کے ساتھ بھی ہوئی اور تین دن مسلسل جاری رہی۔ اس دوران بھی مترجم کے فرائض راقم نے ادا کیے۔ شیخ ابو یحیی رحمۃ اللہ علیہ نے مقاصدِ جہاد اور توحیدِ باری تعالیٰ کے باہمی ربط پہ ایک خوبصورت بیان فرمایا۔ شیخ سعید رحمۃ اللہ علیہ نے تجوید پڑھائی اور فنِ انتظام و ادارت پر ایک عمدہ درس دیا۔ شیخ خالد حبیب رحمۃ اللہ علیہ نے فنِ حرب کے بعض پہلوؤں پر اپنے طویل تجربات کی روشنی میں نہایت مفید اور مؤثر گفتگو کی۔ شیخ عطیۃ اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے تزکیہء نفس اور حفاظتِ قلب سے متعلق ایک دل کو چھونے والا وعظ فرمایا۔ اسی طرح کچھ دیگر مقررین نے بھی اپنا اپنا حصہ ڈالا۔ نماز کی امامت عموماً شمالی وزیرستان کے مجاہدین کے امیر کرواتے تھے۔ اس موقع پر ایک لائقِ ذکر امر یہ دیکھا کہ شیخ سعید رحمۃ اللہ علیہ سمیت تمام دیگر مشائخ، مقامی طالبان کی تالیفِ قلب کے لیے حنفی طریقے کے مطابق ہی نماز ادا کرتے اور اسی طریقے سے وضو بھی کرتے اور اقامت بھی پڑھتے۔ یہی طرزِ عمل شہید بیت اللہ محسود رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ نشستوں میں بھی دیکھنے کو ملا۔ یقیناً انصار و مہاجرین کے درمیان مضبوط رشتوں کی بناء ڈالنے اور مختلف مسلکی پس منظروں سے تعلق رکھنے والوں کو ایک دشمن کے خلاف متحد کرنے میں القاعدہ کی علمی و عملی قیادت کی اس وسعتِ ظرفی، بالغ النظری اور دینِ اسلام کے فہمِ سلیم کا بہت گہرا دخل رہا۔ یقیناً یہ طرزِ عمل امت کی قیادت و رہنمائی کے منصب پر فائز تمام حضرات اور بالخصوص امرائے جہاد کے لیے لائقِ تقلید ہے۔

جرأت و شجاعت

اس دعوتی تڑپ کے ساتھ ساتھ شیخ رحمۃ اللہ علیہ کو شجاعتِ ایمانی سے بھی حظِ وافر ملا تھا۔ آپ کی

سیرت کا یہ پہلو ہم پر اس وقت زیادہ کھلا جب فوج نے محسود میں فیصلہ کن آپریشن کا فیصلہ کیا۔ شیخ رحمۃ اللہ علیہ اس عرصے میں بہت کم آرام کرتے اور بیت اللہ شہید کے ساتھ مستقل ملاقاتیں کر کے ان کو محاذ اور خطوط منظم کرنے اور جنگی تیاریاں تیز کرنے پر ابھارتے۔ شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے تمام میسر مالی، عسکری اور افرادی وسائل اس جنگ کے لیے پیش کیے اور محسودی مجاہدین کے شانہ بشانہ کھڑے ہونے کا حق ادا کیا۔ اگرچہ ان ایام میں پاکستانی جیٹ طیاروں کی وحشیانہ بمباری کا سلسلہ عروج پر تھا اور تمام ساتھیوں کا اصرار تھا کہ شیخؒ علاقہء محسود چھوڑ کر شمالی وزیرستان چلے جائیں لیکن آپ زمینی پیش قدمی کے آغاز تک اپنا زیادہ وقت محسود ہی میں گزارتے رہے۔ آپ نے مکین اور برونَد وغیرہ کی سمت خود محاذوں پر جا کر خطِ اول کا جائزہ لیا...... ساتھیوں کو قیمتی مشوروں سے نوازا...... فوج کا رستہ کاٹنے کے لیے بارودی سرنگیں بچھوانے اور سڑکوں پر رکاوٹیں کھڑی کروانے کا اہتمام کیا...... محسود میں مجاہد ساتھیوں کے قائم کردہ ہسپتال کی ضروریات کو پورا کروانے پر توجہ دی...... غرض مانندِ سیماب محسود میں ایک سمت سے دوسری اور دوسری سے تیسری کی جانب متحرک رہے۔ اس دوران متعدد بار جیٹ طیاروں کے میزائل آپ کے قریب آکر لگے مگر آپ کے ساتھ موجود ساتھیوں نے بتایا کہ وہ ایسے مواقع پر آپ کی سکینت اور طمانیت دیکھ کر حیران رہ گئے۔

زہد و استغناء

شیخ کی سیرت کا ایک اور نمایاں پہلو آپ کا زہد اور استغناء تھا۔ ہم نے آپ کو حبِ دنیا سے کوسوں دور پایا۔ شیخ عطیۃ اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بار یہ بات بیان فرمائی کہ جب وہ ایران کے سفر سے واپس وزیرستان آئے تو ساتھیوں نے ان کے اور ان کے اہلِ خانہ کے لیے ایک ایسے گھر کا انتظام کیا جو نسبتاً چھوٹا اور تنگ تھا اور اس میں سہولیات بھی نہ ہونے کے برابر تھیں۔ شیخ عطیہ فرماتے ہیں کہ: میرے دل میں یہ شکوہ پیدا ہوا کہ نجانے شیخ سعید اور دیگر ذمہ داران خود کتنے اچھے گھروں میں رہتے ہوں گے اور میرے لیے ایسا تنگ سا گھر دیا ہے۔ ایک دن شیخ سعید رحمۃ اللہ علیہ شیخ عطیہ کو اپنے گھر لے گئے۔ شیخ عطیہ فرماتے ہیں کہ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ شیخ سعید بکریوں کے لیے استعمال ہونے والے ایک نہایت تنگ و تاریک ڈربہ نما کمرے کو

صاف کر کے اس میں رہائش پذیر تھے۔ شیخ فرماتے ہیں کہ یہ دیکھ کر میرے دل سے شیخ سعید رحمۃ اللہ علیہ کے لیے دعائیں نکلیں اور مجھے اپنے دل میں آنے والے خیالات پر بہت ندامت ہوئی۔

اسی طرح ایک بار گرمیوں کا موسم تھا، دوپہر کا وقت تھا اور گرمی کی شدت اپنے عروج پر تھی۔ ایسے میں میں کسی کام سے باہر نکلا تو میران شاہ بازار کے نزدیک ہی سڑک کے کنارے شیخ سعیدؒ کی گاڑی کو کھڑا پایا۔ میں اپنی گاڑی روک کر اترا اور شیخ سے ملنے کے لیے ان کی گاڑی میں بیٹھ گیا۔ دیکھا تو معلوم ہوا کہ شیخ کی گاڑی میں اے سی کام نہیں کرتا تھا اور شیخ پسینے میں شرابور، کسی ملاقاتی کے انتظار میں گاڑی میں بیٹھے تھے اور احتیاط کے سبب گاڑی کے شیشے بھی نہیں کھول سکتے تھے تاکہ کوئی پہچان نہ لے۔ مجھے بہت شرم آئی کیونکہ میں جس گاڑی سے اترا تھا اس کا اے سی چل رہا تھا مگر شیخ اس سہولت کے بغیر گرمی سے بے پروا اپنے جہادی فرائض کی ادائیگی میں مشغول تھے۔ بلاشبہ ہم نے آپ کو کبھی بھی آسائشوں کا طالب یا دنیا کا حریص نہیں پایا ...... اور یقیناً جس کے دل سے دنیا نکل جائے، اس کو دشمن نہ تو جھکا سکتا ہے اور نہ ہی ڈرا سکتا ہے!

رعب و دبدبہ

شیخ کی انھی عالی صفات کے سبب اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایک خاص قسم کے رعب سے نوازا تھا۔ آپ کی تمام تر شفقت، عاجزی اور محبت کے باوجود آپ کے سامنے سنبھل کر بیٹھنا پڑتا تھا اور سوچ سمجھ کر بات کرنا پڑتی تھی۔ رعب اللہ تعالیٰ کی عطا ہے جو آپ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمائی تھی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں سے جو جس قدر آپؐ کی سنتوں کی اتباع اور آپ کے اخلاق و اوصاف کی نقل کرے، اسی قدر اس کو یہ رعب نصیب ہوتا ہے۔ شیخ سعید کو اللہ تعالیٰ نے جس رعب سے نواز تھا اس کی ایک مثال یہ ہے کہ ایک بار جیو ٹی وی کے ایک صحافی اور کراچی پریس کلب کے صدر (جو اب اس دنیا میں نہیں رہے، اللہ ان کی مغفرت فرمائے) آپ کا انٹرویو لینے آئے۔ یہ شیخ رحمۃ اللہ علیہ کا کسی ٹی وی چینل کو پہلا انٹرویو تھا۔ انٹرویو لینے والا صحافی ایک سینئر صحافی تھا اور سالوں صحافت کے میدان میں گزار چکا تھا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ صحافی اعتماد سے پُر ہوتا اور شیخ پریشان ہوتے، مگر معاملہ بالکل برعکس ہو گیا۔ راقم اپنے عزیز ساتھی اور

محبوب بھائی شہید مصعب رحمۃ اللہ علیہ سمیت اس موقع پر موجود تھا۔ ہم دونوں نے یہ بات محسوس کی کہ جب اس صحافی نے شیخ رحمۃ اللہ علیہ سے سوالات پوچھنا شروع کیے تو اس کے ہاتھ باقاعدہ کانپنے لگے اور زبان متعدد بار لڑکھڑائی...... جبکہ شیخ پورے اطمینان سے جوابات دیتے رہے۔ تب سمجھ آیا کہ اسلاف کی اس بات کا کیا مطلب ہے کہ: ''علی قدر خوفك من الله یھابك الخلق...''یعنی: جتنا تم اللہ سے ڈرو گے اتنا ہی مخلوق تم سے خوف کھائے گی[6]!

آخری ملاقات...

آخری عرصے میں شیخ سے ایسا قربت کا تعلق ہو گیا کہ وہ اہم ملاقاتوں میں اکثر ہی راقم کو اپنے ساتھ رکھنے لگے...... اپنے گھر بھی لے کر گئے۔ آپ کے ساتھ گزرنے والے وقت میں ایسی حلاوت تھی کہ کچھ دن آپ سے ملاقات نہ ہوتی تو دل بے چین ہو جاتا۔ آپ کو دیکھتے ہی چہرے پہ مسکراہٹ اور دل میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی۔ آپ کا چہرہ بھی اس ناکارہ کو دیکھ کر کھل اٹھتا...... بچھڑ بھی جاتے تو خوابوں میں ایک دوسرے سے ملاقاتیں چلتی رہتیں۔ ایک دن شیخِ محترم کچھ دنوں کے وقفے کے بعد ملے تو فرمانے لگے: ''میں نے تمہیں خواب میں دیکھا کہ تم میرے پاس بیٹھے مجاہدین کے درمیان وحدت کی کمی پہ غم کا اظہار کر رہے ہو اور بات کرتے کرتے زار و قطار رونے لگے ہو''۔ یہ کہہ کر شیخ مسکرانے لگے اور دعا دی کہ اللہ تمہاری تڑپ سچی کر دیں اور اسے قبول کر لیں!

شیخ سے آخری ملاقات شمالی وزیرستان کے علاقے بویا میں ایک انصار کے گھر ہوئی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ اس کے دو تین دن بعد ہی آپ اسی گھر سے محض چند کلومیٹر دور ایک اور انصار کے گھر میں شہادت کا مقام پائیں گے۔ میں نے حسبِ معمول آپ کے لیے بہت سے سوالات جمع کر کے رکھے ہوئے تھے۔ آپ کے ساتھ دو دن گزارے۔ دوسرے دن عصر سے لے کر رات ایک بجے تک آپ کی سمع خراشی کی...... آپ نے

[6] یہ حضرت یحیی بن معاذ رازی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے جسے بیہقی رحمۃ اللہ علیہ نے شعب الإیمان میں روایت کیا ہے۔ اسی مفہوم کے اقوال دیگر اہلِ علم سے بھی مروی ہیں۔ نیز کچھ ضعیف احادیث میں بھی اسی سے ملتی جلتی عبارتیں ملتی ہیں۔

شدید تھکاوٹ کے باوجود حسبِ معمول نہایت خندہ پیشانی اور تحمل سے میری ہر بات سنی اور اس کا تشفی بخش جواب دیا...... میری کچھ غلطیوں پر ٹوکا اور اصلاح فرمائی...... ایک مشتبہ نوعیت کے ہدف پر عسکری کارروائی درپیش تھی...... آپ نے سختی سے اس مشتبہ کام میں ہاتھ ڈالنے سے روکا...... نوجوانوں کی باگیں ایسے حکیم و دانا بزرگوں کے ہاتھ میں ہونا اسی لیے ضروری ہے تاکہ جوش اور ہوش میں توازن رہے...... میں نے ازبک بھائیوں کے ایک گروپ سے بعض اختلافات کو کم کرنے اور معاملات کو سلجھانے پر شیخ سے قدم اٹھانے کی درخواست کی...... الحمد للہ شیخ نے میری درخواست قبول کی اور ان فاصلوں کو مٹانے کے لیے بھی بعض اقدامات پر اتفاق کیا۔ رات کے ایک بجے جب شیخ کو تھکاوٹ کے سبب اونگھ آنے لگی، اور میری گفتگو کے سارے نکات پر سیر حاصل بحث بھی مکمل ہو گئی تو شیخ نے کمال شفقت سے پوچھا: ''کیا ہماری گفتگو مکمل ہو گئی؟ کچھ آرام نہ کرلیں؟'' یوں ہماری یہ آخری نشست اختتام کو پہنچی۔ شیخ حسبِ معمول تہجد پہ بیدار ہوئے اور سب کو بیدار کیا۔ فجر کے بعد میں نے رخصت چاہی اور وانا کی سمت روانہ ہو گیا۔

اک شجرِ سایہ دار جو کٹ گیا...

وانا پہنچے دو دن ہی گزرے ہوں گے کہ ڈرون حملے میں شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی شہادت کی الم ناک خبر پہنچی! میرا وجود اندر تک ہل کر رہ گیا...... آنسو بے اختیار رواں ہو گئے...... میں ہی نہیں، نجانے کتنے مجاہدین اور امت کے کتنے ہی بیٹے ایک شفیق باپ اور ایک عظیم قائد و مربی سے محروم ہو گئے...... محسنِ امت شیخ اسامہ رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کی شہادت کے بعد شیخ عطیۃ اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے نام اپنے خط میں لکھا:

''أبدأ رسالتي هذه إليكم بعزائي لنفسي ولكم في أخينا الكريم الشيخ سعيد رحمه الله، نرجو الله سبحانه و تعالىٰ أن يكرمه بما تمنى فيتقبله في الشهداء ويجعل صبره وثباته في ميزان حسناته۔

فقد أمضى رحمه الله قرابة ثلاثة عقود وهو في ساحات الجهاد نصرة لدين الله، نحسبه والله حسيبه، وصمد صمود الجبال الراسيات ضد حملات العدو على وزيرستان صمودا وصبرا بقناعة واستعذاب طالما أنه في ذات الله سبحانه وتعالىٰ،

فلا شكوى ولا تسخط حتى وإن هددت حياته وحياة فلذات كبده، نحسبه كذلك ولا نزكي على الله أحدا"۔

"میں اس خط کا آغاز خود اپنے آپ سے اور پھر آپ سے تعزیت کے ساتھ کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہمارے محترم بھائی شیخ سعید رحمۃ اللہ علیہ پر اپنی رحمتیں فرمائیں، آپ شہادت کا جو مقام پانے کی تمنا کیا کرتے تھے اللہ تعالیٰ وہ مقام آپ کو نصیب فرمائیں اور آپ کے بے پایاں صبر واستقامت کو آپ کی نیکیوں کے پلڑے میں شمار فرمائیں، آمین! آپ نے محض اللہ کے دین کی نصرت کی خاطر جہاد کے میدانوں میں تقریباً تین دہائیاں گزاریں، ہم آپ کے بارے میں ایسا ہی گمان رکھتے ہیں اور اللہ ہی بہترین حسیب ہے! آپ نے وزیرستان پر دشمن کے وحشیانہ حملوں کا مقابلہ بلند وبالا پہاڑوں کی سی مضبوطی سے کیا، ہر قسم کے حالات میں ثابت قدم رہے، صبر کا دامن تھامے رکھا اور اللہ رب العزت کے فیصلوں پر ہمیشہ راضی رہے۔ یہی نہیں، بلکہ اللہ کی خاطر تکالیف سہنے میں آپ لطف وحلاوت محسوس کرتے اور کبھی گلے شکوے کا حرف تک زبان پر نہ آنے دیتے، چاہے اس راہ میں آپ کی اپنی جان یا آپ کے جگر گوشوں کی جانیں بھی داؤ پر لگ جاتیں......! ہمارا آپ کے بارے میں یہی گمان ہے اور ہم اللہ کے سامنے کسی کی پاکیزگی نہیں بیان کرتے"۔

شیخ تو ہم سے بچھڑ گئے مگر آپ کے ساتھ گزرے لمحوں کی حسین یادیں کبھی نہیں بچھڑیں...... البتہ یہ امید کافی معدوم سی ہو گئی کہ اس جہانِ فانی میں ہماری نگاہیں ایسا اللہ کا ولی، ایسا فرشتہ صفت انسان، ایسا غم خوارِ ملت، ایسا قلبِ صافی اور "خياركم الذين إذا رؤوا ذكر الله"[7] (تم میں سے بہترین وہ ہیں جنہیں دیکھ کر اللہ یاد آجائے) کی ایسی سچی تصویر کبھی دوبارہ دیکھ پائیں گی۔

اللہ ان کی شہادت قبول فرمائے...... جنتوں میں ان کا ساتھ نصیب فرمائے...... اور امت کو اپنے ان محسنین کی قدر کرنے کی توفیق دے!

---

[7] رواه ابن ماجة، وهو عند البخاري بلفظ آخر في [الأدب المفرد]

مجاہد عالمِ دین، فقیہ، اصولی اور مفسر شیخ ابو قتادہ فلسطینی حفظہ اللہ نے برطانیہ کی جیل میں اسیری کے دوران "القواعد الأول في بناء الإنسان والدول" (یعنی: 'تعمیرِ انسان اور تعمیرِ ریاست کے بنیادی اصول') کے عنوان سے ایک کتاب لکھی ہے۔ اس کتاب میں آپ صحابہ و تابعین کی دریادلی، مہمان نوازی، سخاوت اور دنیا اور سامانِ دنیا سے ان کے قلوب کی لاتعلقی کی ایک عجیب مثال بیان کرتے ہیں۔ آپ لکھتے ہیں:

"تین لوگوں میں بحث ہوگئی کہ مسلمانوں میں سب سے زیادہ سخی کون ہے؟ ایک نے کہا کہ حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے بیٹے عبد اللہ سب سے سخی ہیں۔

دوسرے نے کہا کہ: نہیں، بلکہ عرابہ اوسی سب سے سخی ہیں۔

تیسرے نے کہا: نہیں، حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کے بیٹے قیس سب سے سخی ہیں۔

پس کعبہ شریف کے صحن میں موجود ان تینوں اشخاص کے درمیان یہ بحث بڑھتی گئی اور آوازیں اونچی ہونے لگیں۔ یہ دیکھ کر ایک سمجھدار شخص نے کہا کہ: بحث کو اتنا کیوں بڑھاتے ہو، حالانکہ اس مسئلے کا حل تو آسان سا ہے۔ تم میں سے ہر ایک اسی کے پاس چلا جائے جس کو وہ سب سے زیادہ سخی سمجھتا ہے، تاکہ ہم بھی دیکھیں کہ وہ تمہارے ساتھ کتنی سخاوت سے پیش آتا ہے؟ یوں خود ہی فیصلہ ہو جائے گا کہ تینوں میں سے زیادہ سخی کون ہے؟

پس تینوں نے ایسا ہی کیا۔ پس ان میں سے ایک حضرت عبد اللہ بن جعفر کے پاس گیا اور اس نے حضرت عبد اللہ کو ایسے موقع پر پایا جب وہ اپنے اونٹ پر بیٹھ چکے تھے اور کسی کام سے روانہ ہونے لگے تھے۔ اس شخص نے ان کو روک کر کہا: "اے رسول اللہ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کے بھتیجے! میری بات سنیئے!" حضرت عبد اللہ نے کہا: "کہو کیا چاہتے ہو"؟ اس شخص نے کہا: "میں مسافر ہوں اور میرا ساز و سامان اور سب اسباب ختم ہو چکے ہیں"۔ حضرت عبد اللہ یہ سن کر سواری سے اتر گئے اور کہا: "اس اونٹ پر سوار ہو جاؤ اور اونٹ پر بندھے بستے میں جو کچھ موجود ہے وہ بھی لے لو اور لو! میری یہ تلوار بھی سنبھال لو۔ یہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی تلواروں میں سے ایک ہے"۔ پس آپ نے وہاں کھڑے کھڑے ہی اپنا اونٹ، اپنا بستہ جس کے اندر جانور کی قیمتی کھال کی بنی ہوئی پوٹلیاں، ان پوٹلیوں میں موجود چار ہزار دینار اور ان سب سے بڑھ کر...... حضرت علی رضی اللہ عنہ کی قیمتی تلوار، یہ سب کچھ اس شخص کے حوالے کر دیا۔

دوسرا شخص حضرت قیس بن سعد کے پاس گیا مگر ان کو سویا ہوا پایا۔ حضرت قیس کی لونڈی نے بتایا کہ "وہ سو رہے ہیں، تم مجھے بتا دو کہ تمہیں ان سے کیا کام ہے"؟ اس شخص نے کہا کہ: "میں مسافر ہوں اور میرا ساز و سامان اور سب اسباب ختم ہو چکے ہیں"۔ لونڈی نے کہا کہ "محض اتنے سے کام کے لیے ان کو جگانے کی بھلا کیا ضرورت؟ یہ پوٹلی لے لو، اس میں سات ہزار دینار ہیں اور اللہ گواہ ہے کہ اس وقت قیس کے گھر میں ان کے سوا کوئی دینار موجود نہیں! نیز باہر اونٹوں کی چراگاہ میں جاؤ اور وہاں موجود ہمارے اونٹوں میں سے کوئی ایک اونٹ لے لو، اس اونٹ کو سفر کے لیے تیار کرنے کے لیے جو کچھ ساتھ لینا ہو وہ بھی لے لو اور وہاں موجود قیس کے غلاموں میں سے ایک غلام بھی تمہارا ہوا"۔ وہ شخص یہ سب کچھ لے کر چلا گیا۔ بعد میں جب حضرت قیس بن سعد کی آنکھ کھلی اور ان کو معلوم ہوا کہ ان کی لونڈی نے کیا کیا ہے، تو انہوں نے اس کے اس کام سے خوش ہو کر اسے بھی آزاد کر دیا!

تیسرا شخص حضرت عرابہ اوسی کے پاس گیا اور ان سے ان کے گھر کے باہر ملاقات کی جب وہ مسجد کی طرف جا رہے تھے۔ حضرت عرابہ نابینا ہو چکے تھے اور وہ اپنے دو غلاموں کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر چل رہے تھے۔ اس شخص نے حضرت عرابہ سے کہا: " اے عرابہ! میں مسافر ہوں اور میرا ساز و سامان اور سب اسباب

ختم ہو چکے ہیں"۔ یہ سن کر حضرت عرابہ نے اپنے ہاتھ پر ہاتھ مارا اور بولے:" لوگوں کا حق ادا کرتے کرتے عرابہ کا سب مال ختم ہو چکا ہے، اس لیے افسوس! کہ اس کے پاس تمہیں دینے کے لیے ان دو غلاموں کے سوا اب کچھ نہیں بچا۔ پس تم ان دونوں کو رکھ لو"! یہ سن کر وہ شخص بولا:" نہیں، یہ تو آپ کے دونوں بازوؤں کی مانند ہیں، میں ان کو نہیں رکھ سکتا"۔ وہ بولے:"اگر تم نے ان دونوں کو نہیں لیا تو پھر یہ میری طرف سے آزاد ہوں گے، پس تمہاری مرضی کہ ان کو لے لو، یا ان کو آزاد ہونے کے لیے چھوڑ دو"۔ یہ کہہ کر وہ دیوار کا سہارا لیتے ہوئے اپنے گھر کی طرف واپس روانہ ہو گئے۔

چنانچہ وہ شخص ان دونوں غلاموں کو ساتھ لے کر اپنے باقی دو ساتھیوں کی طرف واپس آ گیا۔ وہ دوبارہ اکٹھے ہوئے تو ان تینوں حضرات کی سخاوت کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکے، لیکن تینوں نے اس پر اتفاق کیا کہ ان تینوں میں سے سب سے سخی حضرت عرابہ اوسی ہیں کیونکہ انہوں نے تنگ دستی کے باوجود اپنی ضرورت کا مال اللہ کی راہ میں دے دیا"۔

(القواعد الأول في صناعة الإنسان والدول، ص: ٣٢،٣٣)

چونکہ اس دور میں اسباب و وسائل پر ایک ایسی تہذیب غالب ہے جو آخرت سے غافل، مادہ پرستی میں غرق اور سرمایہ دارانہ طرزِ زندگی پر عامل ہے، اس لیے اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان ویقین انسان میں جو عالی صفات و اخلاق پیدا کرتے ہیں، وہ آج معدوم ہوتے جا رہے ہیں۔ مسلمان معاشروں پر بھی انہی مغربی معاشروں کا رنگ چڑھ چکا ہے جہاں ہر فرد اپنی ذات کے حصار میں جیتا ہے، دوسروں کا حق ادا کرنے سے زیادہ اپنے حقوق کا مطالبہ کرنے پر توجہ ہوتی ہے اور انفاق کرنے کی بجائے مال سمیٹ، بچا کر رکھنے کی حرص ہوتی ہے۔ یہی مذموم اوصاف معاشرے کو مستقل باہم کھینچا تانی اور بے اطمینانی کی حالت میں رکھتے ہیں اور گھروں، خاندانوں اور محلوں میں زندگیاں باہم لڑائی جھگڑوں اور مستقل کشمکش کے سبب عذاب بن جاتی ہیں۔ اس کے برعکس ہم جن اسلاف کے نام لیوا ہیں، ان کے معاشرے باہمی محبت، رحمت، شفقت، ہمدردی، بھائی چارگی کا جیتا جاگتا نمونہ ہوا کرتے تھے اور ایسے معاشرے میں زندگی سکونِ قلب کا باعث ہوتی تھی۔ مغربی تہذیب اور سیکولر طرز زندگی نے ہمیں ہمارے اسلاف والے جن عالی اوصاف سے محروم کیا ہے انھی میں سے ایک مہمان

کا اکرام اور سخاوت و دریادلی ہے۔ اللہ پر توکل میں کمزوری، اجر وثواب حاصل کرنے کے جذبے میں کمی اوراسبابِ دنیا کی محبت میں اضافے کے سبب دل ایسے تنگ ہو چکے ہیں کہ فی سبیل اللہ مال لٹانا، اہلِ ایمان پر مال خرچ کرنا بلکہ مہمان کے لیے محض کچھ وقت نکالنا اور حاجت مند کو دو میٹھے بول کہنا بھی اب نفوس پر شاق گزرتا ہے۔ سخاوت کا مظاہرہ کرنا تو دور کی بات، فرض زکوٰۃ کی ادائیگی بھی دشوار ہو چکی ہے۔ پس ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم اللہ سے مدد مانگتے ہوئے اپنے دلوں کی تنگی سے نجات پانے کی کوشش کریں اور اسلاف کی ان روشن مثالوں کو سامنے رکھتے ہوئے اپنی استطاعت کے بقدر ان کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کریں۔ اللہ ہمارے اخلاق واعمال کی اصلاح فرمادے اور ہمیں وہ اوصاف نصیب فرمادے جو اس کو محبوب ہوں، آمین!

علماء کی ذمہ داریاں

ستر کی دہائی میں وطنِ عزیز پاکستان میں اسلام کو درپیش 'سوشلزم' کے خطرے کے تحت محدثِ عصر مولانا یوسف بنوری رحمہ اللہ نے علماء سے جو خطاب کیا تھا، وہ آج 'سیکولرزم'، 'لبرلزم'، 'مغربی سرمایہ داری'، 'جمہوریت' اور جرنیلی اسلام دشمنی کے مقابلے کے لیے کیا دعوتِ خطاب نہیں!؟

"علماء پر سب سے زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ کامل اخلاص اور پوری تندہی سے اس وقت کام کریں۔ وہ یہ سوچیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ عزت دی ہے وہ سب کچھ رسول اللہ ﷺ کے دین مبین کا صدقہ ہے۔ مسلمانوں میں ہماری جو کچھ عظمت واحترام اور ادب ہے وہ سب اللہ کے دین سے وابستہ ہونے کی وجہ سے ہے۔ آج اس ملک میں اسلام پر جو کچھ گزر رہا ہے یا گزرنے والا ہے، اس میں علماء کیا کردار ادا کریں گے؟ دنیا کی آنکھیں اس کی طرف لگی ہوئی ہیں۔ علماء جو کچھ کریں گے، تاریخ اپنے سفینوں میں اور قوم اپنے سینوں میں اس کو ہمیشہ محفوظ رکھے گی۔ آج علماء کے امتحان کا وقت آگیا ہے۔ ضرورت ہے کہ ہم حق کہیں اور حق کے لیے کہیں، اور حق تعالیٰ جل مجدہ کی رضا وخوشنودی کے لیے کہیں اور جو کام کریں نفس کا شائبہ تک اس میں نہ ہو۔

لہٰذا علماء ربانیین کا اہم فریضہ ہے کہ وہ سروں سے کفن باندھ کر میدان میں آجائیں، بہت بے حسی اور بے غیرتی کی بات ہوگی کہ دین پر نازک ترین وقت آجائے اور ہم خاموش تماشائی بنے بیٹھے رہیں اور تاویلیں کرتے رہیں کہ ابھی عزیمت کا وقت نہیں، رخصت پر عمل کیا جاسکتا ہے۔

مجھے امید ہے کہ ایسا نہیں ہوگا، علماء خاموشی سے نہیں بیٹھیں گے، ان شاء اللہ ثم ان شاء اللہ۔ ہماری تو آرزو ہے کہ دین کے ہم سے پورے ہو جائیں۔ الحمد اللہ بیس سال سے شہادت کی آرزو سے اپنے سینہ کو گرم کر رکھا ہے اس سے بڑی کیا خوش نصیبی ہوگی کہ اس کی راہ میں شہادت نصیب ہو۔ لیکن ضرورت اس کی ہے کہ علماء کی طرف سے کام ہو مگر صحیح، درست، عقل اور تدبیر سے ہو، اللہ کو راضی کرنے کے لیے اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ہو، وما ذالک علی اللہ بعزیز"۔

(بصائر وعبر، جلد اول، ص ۵۳، ۵۴)